Presentation Copy

[illegible]

Ram Babu Saksena

Delhi
16/4/1952

pictures of Amir, Asir, Jalal in a group facing page 130

1. picture of Jan Sahab facing P. 984

2. certain correct dates of deaths of poets culled from old newspapers of Rampur.

Oudabai Sikandri

3. Munir Shikohabad's Son

1106

مسدس تہنیت جشن بے نظیر

مصنفہ
میر یار علی جان صاحب ریختی گو

مرتبہ:۔
محمد علی خاں اثر رامپوری

مطبوعہ اسٹیٹ پریس رام پور

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

طبع اوّل — سنہ ۱۹۵۰ء

قیمت دو روپیہ چار آنہ (عہ/)

فہرست مضامین

انتساب

میں اپنی اس تالیف کا انتساب ادب نواز فخر
نسواں جناب جمشید جہاں بیگم صاحبہ رامپوری بنت جناب
مسٹر قمر شاد خاں صاحب مرحوم بار ایٹ لاء سابق
جوڈیشل منسٹر رامپور و رئیس اعظم روہیل کھنڈ کے
نام نامی سے کرنے پر خاص مسرت محسوس کرتا ہوں
جن کی ادنیٰ توجہ سے یہ تالیف موجودہ شکل میں منظر عام پر
آئی۔

محمد علی خان اثر رامپوری

تقریب

نواب سید کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کا عہدِ ریاست رام پور کی تاریخ کا سنہرا ورق ہے۔ انھوں نے ریاست کی بساط سے زیادہ علم و فن کی قدر دانی کا حوصلہ پایا تھا۔ اور علما، شعرا، ادبا وغیرہ اہل ہنر کی وہ پرورش اور قدر کی تھی کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال صرف بادشاہوں اور صوبے داروں کے ہاں مل سکتی ہے۔

ان کی محفلِ علم کے حاشیہ نشینوں میں میر یار علی جان صاحب بھی تھے جو ریختی گوئی کے خاتم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ کتاب خانہ رام پور میں ان کے ایک مسدس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے جو باغ بے نظیر کے میلے پر لکھا گیا تھا اور "مسدس بے نظیر" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مسدس باوجود اہم ادبی کوشش ہونے کے ان کے دیوان کے اس اڈیشن میں بھی شامل نہیں ہے جو مطبع انوار احمدی الہ آباد سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔

بظاہر یہ نسخہ نواب خلد آشیاں کے حضور میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اور اس لئے اس کے مستند ہونے میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

تاریخ ادب اردو میں جان صاحب کی اہمیت کے پیش نظر عرصے سے میرا ارادہ تھا کہ کتاب خانے کی طرف سے اس مسدس کو شائع کر دیا جائے لیکن دوسری اہم کتابوں کی اشاعت کے انتظام نے اس کی مہلت نہ دی کہ اس کام کو خود کتاب خانے کی طرف سے انجام دیا جاتا۔

حسنِ اتفاق سے مجھے صدیق مکرم جناب مولانا محمد علی خاں صاحب اثر سے معلوم ہوا کہ وہ "بے نظیر کے میلے" پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے موصوف کو بآسانی اس پر آمادہ کر لیا کہ جان صاحب کے "مسدس بے نظیر" کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا لیں اور اس طرح جان صاحب کی کاوش اور میلہ بے نظیر کی یاد دونوں کو زندہ کر دیں۔

اثر صاحب نے مسدس کی شخصیتوں اور بے نظیر سے متعلق تمام جزئیات کی تحقیق جس عمدگی سے کی ہے ہر وہ شخص اس کی داد دینے پر مجبور ہوگا جس نے کبھی کوئی تحقیقی کام کیا ہے۔ اس لئے میں یہ کہنے میں مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ انھوں نے بہت سی مردہ شخصیتوں کو تاریخی زندگی عطا کر دی۔

امید ہے کہ ارباب ادب اس کی کما حقہٗ قدر فرمائیں گے۔

رضا لائبریری رامپور
۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۵۸ء

امتیاز علی عرشی
ناظم



اثر رامپوری

دیباچہ

تمہید میں بچپن ہی سے "باغ بے نظیر" کے بے نظیر میلے کی تعریف اپنے بزرگوں سے سنتا چلا آیا ہوں
یاد نہیں آتا کہ بیان کرنے والے نے بیان سے پہلے کم از کم ایک ٹھنڈی
سانس نہ لی ہو۔ اور اس کی آنکھیں پُرنم نہ ہو گئی ہوں۔ گو اس میلے کے
حالات مرتب کرنے کا جذبہ ایک مدت سے دل میں موجود تھا۔ لیکن اس کے
ابھرنے کا موقع اُس وقت آیا جب کہ اُن بزرگوں میں سے جنھوں نے میلوں کی
بہاروں کے سایہ میں اپنا شباب گزارا تھا۔ اور ان بہاروں کی خوشبوؤں کی
مہک ان کے دماغوں میں ابتک باقی تھی، اکثر نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔
اور یہ خطرہ دامنگیر ہو گیا کہ اگر انگلیوں پر گنی جانے والی باقی ہستیاں بھی
رخصت ہو گئیں تو تحقیقات کے نتائج چند کتابوں اور اخباروں کے پرانے
فائلوں ہی تک محدود رہ جائیں گے۔ اور عینی شاہدوں کی معتبر روایتوں سے
مایوس ہو کر ہم اس قابل نہ رہیں گے کہ میلے کے مختلف پہلوؤں کی تمام تفصیلات کو

وضاحت کے ساتھ بیان کر سکیں

یہ وجوہ تھے جنھوں نے اس تاریخی میلے کے حالات فراہم کرنے پر مجھے آمادہ کر دیا۔ اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم "باغ بے نظیر" کی طرف اٹھا۔ وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے داروغہ سے حالات پوچھنا چاہا۔ وہ میرے سوال کو سنکر کچھ دیر تو سناٹے میں رہا اور چند منٹ بعد اس کی مہر سکوت ٹوٹی تو اس شعر پر۔ ؎

یہ سب بے سبب نہیں خالی گھروں کے سناٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

شعر سننے کے بعد جب میں نے اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پرنم ہو چکی تھیں۔ غرض محل وقوع اور ضروری حالات معلوم کر کے میں ایک خاص اثر دل میں لیے ہوئے واپس آیا۔

مسدس

کچھ دن بعد حسن اتفاق سے میری ملاقات مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتابخانہ سرکاری سے ہوئی۔ میں نے جب ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو موصوف نے میر یار علی جان صاحب مشہور ریختی گو کی ایک باتصویر مسدس کا پتہ بتایا جو بے نظیر کے میلے پر قلمی لکھا ہوا کتابخانے میں محفوظ تھا۔ چونکہ اس مسدس کے اچھوتے مضامین سے دنیائے ادب اب تک نا آشنا تھی۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہی مسدس"

موضوع سخن قرار دیا جائے۔ اور میلے کے حالات ضمنی طور پر اس کے پہلو میں جگہ پائیں۔

میری ذاتی رائے ہے کہ اگر اس میلے کے حالات بدستور پردہ خفا میں رہتے تو اردو ادب کا ایک بے بہا ذخیرہ ہماری خوفناک بے التفاتی کی نذر ہو جاتا اور جن حضرات کے دل و دماغ کو امیر و داغ جلال و تسلیم غالب و منیر اور جان صاحب وغیرہم جیسے مشاہیر شعرائے اردو کی شاعری نے مسحور کر لیا ہے وہ اساتذۂ مذکور کے ان جذبات منظر نگاری و نکتہ آفرینی سے جو اس میلے کی متعلقہ نظموں کی جان ہیں محروم رہ جاتے اور اردو ادب میں بحیثیت مجموعی ایک خصوصی باب کا اضافہ نہ ہوتا۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا۔ کہ مسدس وغیرہ کی شخصیتوں کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کافی وقت صرف کیا گیا ہے اور ہر روایت میں درایت کا پہلو پیش نظر رہا ہے کسی ایک بیان کو اس وقت تک اعتبار کا درجہ نہیں دیا گیا جب تک کہ دوسرے معتبر بیانات یا تحریروں نے اس کی تصدیق و تائید نہ کر دی ہو۔

شعرا کے حالات کی چھان بین میں بھی پوری کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ بعض شعراء ایسے ہیں جن کے حالات تذکروں میں بہت کم پائے گئے یا بالکل نہیں پائے گئے اور بعض مشہور شعراء ایسے ہیں جن کے حالات

بیان ہیں۔ تذکرے مختلف البیان ہیں۔ چنانچہ تحقیقِ مزید کے ذریعہ ان تمام مشکلات پر قابو پانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

سرکاری ملازمان اور فنِ موسیقی کی باکمال ہستیوں کی تحقیق کے بارے میں اخبارات اور کتابیں امداد سے قطعاً معذور ہیں تاہم سعی و تلاش پیہم سے جو نتائج پیدا کیے وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

میرا دائرہ تحقیق نہ صرف رامپور کی حد تک محدود رہا۔ بلکہ دلی لکھنؤ بمبئی کانپور اور شکوہ آباد تک بار بار متجاوز ہوتا رہا۔

تشکر

میں ان تمام اصحاب کا شکرگزار ہوں جنہوں نے اس سلسلے میں میری کسی قسم کی بھی مدد کی ہے۔ اور میری تحقیقات کی تکمیل میں کچھ بھی حصہ لیا ہے۔

محمد علی خاں اثر

سب سے پہلے جذباتِ تشکر کے مستحق میرے محترم دوست مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتابخانہ سرکاری ہیں جن کی بدولت مجھے مسدس کی نقل دستیاب ہوئی

اس کے بعد مولوی فضل حسن خاں صاحب صابری مالک و مدیر اخبار "دبدبہ سکندری" رامپور ہیں جنہوں نے اخبار مذکور کے پرانے فائل بسلسلۂ تحقیق دیکھنے کی اجازت دی۔

میلے کے چشم دید حالات کے سلسلے میں منشی محمد اسمٰعیل خاں صاحب صابر رامپوری

شاگرد تسلیم لکھنوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ موصوف ہی نے میلے کے مقامات کا نقشہ تیار کر کے دیا تھا۔ افسوس کہ وہ کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے علاوہ محمد علی خاں عمر ۸۵ سال سابق ملازم زمرۂ سواران عہد خلد آشیاں ساکن محلہ باجوڑی ٹولہ اور کرم علی خاں عمر ۹۰ سال سابق ملازم رسالہ علی غول نواب خلد آشیاں ساکن محلہ ٹھاٹرزئی اور صاحبزادہ احسان اللہ خاں صاحب عمر ۸۳ سال ساکن محلہ علقۂ الٰہی یا قابل ذکر ہیں

ارباب موسیقی کے حالات میں زیادہ امداد منشی فدا علی خاں صاحب پسر امیر خاں صاحب بین کار ریٹائرڈ تحصیلدار ساکن کوچہ قاضی رام پور اور حبیب الرحمن خاں ولد سلطان بیگ عمر ۸۲ ساکن محلہ چاہ شور سے ملی۔

فن موسیقی کی اکثر اصطلاحات فدا علی خاں صاحب اور سید ابن علی صاحب مصاحب سرکار و افسر ارباب نشاط سے معلوم ہوئیں۔

محاورات لکھنؤ کے بارے میں علامہ سید اولاد حسین صاحب شاداں مرحوم بلگرامی پروفیسر فارسی اور لسان القوم حضرت صفی لکھنوی نے رہنمائی فرمائی۔

شعرائے کرام اور ملازمان کے حالات ان کے اعزا سے معلوم ہوئے جن کا حوالہ ہر شخص کے حالات کے سلسلے میں دیدیا گیا ہے

تفصیل ماخذ تحریری

۱ اخبار الصنادید (تاریخ راپور) مولفہ مولوی نجم الغنی خاں۔

۲ انتخاب یادگار۔ مولفہ امیر مینائی

۳ تاج الاخبار ۱۸۷۶ء

۴ متعدد اخبارات دبدبہ سکندری راپور

۵ کلیات منیر شکوہ آبادی مطبوعہ ۱۸۷۹ء

۶ مثنوی فریاد داغ مطبوعہ ۱۳۰۰ھ

۷ مثنوی شاہد شوخ طبع (جلال لکھنوی) ۱۸۸۱ء

۸ مہتاب داغ

۹ گلزار داغ

۱۰ مثنوی تاریخ بدیع از تسلیم لکھنوی مطبوعہ ۱۲۹۸ھ

۱۱ تذکرہ خمخانۂ جاوید۔ از لالہ سری رام۔ ایم۔ اے۔

۱۲ تذکرہ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۱۳ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ

۱۴ تاریخ نظم و نثر اردو۔ از آغا محمد باقر۔ ایم۔ اے

۱۵ تذکرہ گل رعنا۔ از حکیم عبدالحی

Dewan Jan Sahab
Nizami Press Budaun
with a long literary introduction
by Agha Haidar Hasan
— The Nizam
Number 2



شبیہ مبارک جناب نواب سید [illegible]

مقدمہ

یاد پھر آئی ہیں آغازِ جنوں کی راتیں
اور پیچھے کو پلٹ گردشِ ایام کچھ تو (اثر رامپوری)

نواب سید کلب علی خاں خلد آشیاں

عہد نواب خلد آشیاں نواب تخلص کہنے کو تو شمالی و مغربی ہند کی ایک اوسط درجے کی ریاست رام پور کے فرماں روا تھے۔ لیکن قدرت نے انھیں ایسی قابلِ رشک صلاحیتوں سے نوازا تھا اور ایسا سازگار زمانہ عطا کیا تھا جس کی بدولت انھوں نے نوابی میں پادشاہی کی۔ ان کی فطری الوالعزمی اور ذوقِ سلیم کو اجاگر ہونے کا موقع اس وقت ملا جب لکھنؤ اور دلی کی سلطنتیں تاراج ہو گئیں اور ان ویرانوں کے قیمتی موتی سیلابِ حوادث کی رَو میں بہہ کر چاروں طرف بکھر گئے۔ ان کی دوربیں نگاہیں اٹھیں

اور جہاں جہاں سے ہوئی دستیاب ہوئے قدردانی کے ہاتھوں سے چنکر اپنے دربار کا گوشہ گوشہ سجا لیا۔

نواب صاحب کی عام عادت تھی کہ اہلِ کمال کو تنخواہ تو کم دیتے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ وقتاً فوقتاً انعامات اور عطیات کی اتنی بارش ہوتی تھی کہ اہلِ کمال فارغ البال ہو جاتے تھے۔ اہلِ کمال کو گرویدہ اور خوش کرنے کے اور بے شمار طریقے بھی انہیں یاد تھے۔ کسی کے مکان پر تشریف لے جا کر اعزاز بڑھا دیا۔ کسی کو کھانے میں شریک کر لیا۔ کبھی ان کے مکانوں پر خوان ہائے طعام شاہی بھجوا دیتے۔ کبھی نایاب میوؤں کے تحفوں سے دل موہ لئے۔ کسی کا مکان سرکاری طرف سے پختہ بنوا دیا۔ کسی کا قرض ادا کر دیا۔ کسی کی تقریب میں معقول رقم عطا کر دی۔ ان سب پر طرہ یہ کہ ہر باکمال سے انتہائی خلوص اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے جلتے کہ بعض اہلِ کمال کی ایسی نازک مزاجیوں کو جو کبھی کبھی حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتی نہیں بطیب خاطر برداشت کرتے۔ برگزیدہ ہستیوں کی تعظیم دیتے۔ اسی کا اثر تھا کہ جو شخص بھی ایک مرتبہ رامپور آ جاتا یہاں سے جانے کا نام نہ لیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب کی ذات میں طلب کمال کا ایسا شدید جذبہ کارفرما تھا کہ جب کسی فن کے صاحبِ کمال یا کسی نادر چیز کی خبر ملتی تو

مزاجیں کرتے اور بغیر حاصل کئے دم نہ لیتے تھے۔ چونکہ وہ مشرقی روایات کے دلدادہ تھے اس لئے کھانے پینے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، دربار اور جلوس غرض کل حرکات و سکنات میں شاہان مغلیہ کے طریقوں پر کاربند رہتے اور جو بات کرتے وہ اپنی جگہ انوکھی اور نرالی ہوتی۔ اگر ان کی زندگی کے تمام واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو بلاشبہ کہنا پڑے گا کہ وہ بعض باتوں میں بادشاہوں سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ ان کی خوش نصیبی کی ہہ ادنیٰ اسی دلیل ہے کہ موت کے بعد بھی جبکہ شاہان جلیل القدر کے مزار سونے پڑے ہیں اور ان پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا تک نہیں۔ نواب صاحب کے مزار پر ایک سو حفاظ باری باری سے روزانہ قرآن مجید پڑھتے اور تلاوت کا ثواب ان کی روح کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ نعت خوان، منصرم، جمعدار، سپاہیان اور فراش وغیرہ کا عملہ بھی تعینات رہتا ہے جن کے مصارف نواب صاحب کی موقوفہ جائداد کی آمدنی سے ہوتے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

خلدآشیاں کا دربار بھی عجب دربار تھا جو ہندوستان کے مشہور علماء، فضلاء، فقراء، شعراء، داستاں گویاں اور مختلف فنون کے اہل کمال سے آراستہ تھا۔ دربار کے اوقات باعتبار فنون مختلف تھے۔ اہل علم کی باری آتی ہے تو شمس العلماء

علامہ عبدالحق صاحب خیرآبادی، مفتی سعد اللہ صاحب، مولوی ارشاد حسین
صاحب مجددی اور سید حسن شاہ صاحب محدث وغیرہ جیسے فضلائے روزگار
عالمانہ لباس میں عمامہ بسر قبا در بر جلوہ گر نظر آتے ہیں، کبھی مشکل مسائل
فقہ پر گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں۔ کبھی منطق و فلسفہ پر دھواں دھار تقریریں
کی جا رہی ہیں۔ کبھی عربی و فارسی ادب کے محاسن اور تحقیقات الفاظ پر
ہنگامہ آرائی ہے۔ موسیقی کی باکمال ہستیوں کی نشست ہوتی ہے تو فن موسیقی کے
جوہر بروئے کار لائے جاتے ہیں اور اہل کمال جائزہ داد سے محروم نہیں رہتے
شعراء کی باری آتی ہے تو حضرات اسیر، امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال لکھنوی
زکی اور جان صاحب ریختی گو وغیرہ اپنے شاعرانہ کمال سے جوہر دکھاتے ہیں
کبھی محاورات اور زبان کی تحقیق پر گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ مشاہیر کے کلام
پر تبصرے اور تنقیدیں ہو رہی ہیں۔ نواب صاحب اپنا کلام سناتے ہیں۔ کبھی
دوسروں کا سنتے ہیں۔ اور جا بجا داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔

میلے کی تاسیس

نواب خلد آشیاں نے طبیعت بڑی جدت پسند پائی تھی ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۲ھ میں مسند نشیں ہوئے تو سال
جلوس کی یادگار قائم کرنے کی غرض سے ایک سالانہ میلے کی تجویز کی۔ تاکہ مقامی
تجارت اور صنعت کو بھی فروغ ہو، شعر و سخن کے بھی چرچے رہیں۔ موسیقی
کے فنون کا بھی کامل مظاہرہ ہو اور ہر خاص و عام اس سے بہرہ اندوز ہو اور

اس طرح سال بھر کچھ دنوں کے لئے غم غلط کرنے کے لحاظ سے جنت لگا د اور فردوس گوش کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ اس میلے کے لئے باغ بے نظیر جو ہر لحاظ سے موزوں تھا پسند کیا گیا اور موسم بہار کے لحاظ سے مارچ کا مہینہ مقرر ہوا چنانچہ اس میلے کی ابتدا مارچ ۱۸۶۶ء میں آج سے ۴۰ برس پہلے ہوئی یہ میلہ نواب صاحب کی حیات یعنی ۱۸۸۷ء تک جس کو اب ۶۳ سال ہوتے ہیں ۲۲ سال جاری رہا۔

یہ میلہ موسم بہار یعنی مارچ کے آخری ہفتے میں ہوتا تھا لیکن مہینوں پہلے اشتہارات مقامی اور غیر مقامی اخبارات وغیرہ میں شائع کرائے جاتے تھے اور اشتہارات جاری ہونے کے بعد ہی سے میلے کی آرائش وغیرہ کے انتظامات شروع ہو جاتے تھے میلے کی مدت معمولاً ۸ روز ہوتی تھی کبھی کبھی دوکانداروں کی خواہش پر دو تین دن کی توسیع بھی ہو جاتی تھی۔ ۱۸۶۹ء[1] میں اس میلے کی مزید ترقی اس طرح ہوئی کہ نقش قدم مبارک رسول کریم علیہ الصلوٰۃ

---

[1] یہ بیان اخبار الصنادید کا ہے لیکن منشی سید محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے جو چند قطعات تاریخ لکھے ہیں ان سے ۱۲۸۶ھ ثابت ہوتے ہیں

چہ خوشا گنبد عالی و نہے تخت پرستش — از پئے کعبۂ دیں رکن شہ اینجاست

مصرع سال بیافتم از غیب ظہیر — گنبد نقش کف پائے محمد اینجاست

۱۲ ۸۶

یہ گنبد پر نور ہے کیونکر ہو صفت — مژگاں سے ہے جاروب کش آہیں ناگہ و مہر

یہ مصرع تاریخ ظہیر اور کہا ہے — نقش قدم شاہ امم سجدہ گہ دہر

۱۲ ۸۶

والتسلیم کے رکھنے کے لئے یک نہایت شاندار عمارت تعمیر ہوئی جس پر میلے کے آخر دن پنکھا چڑھانے کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا ہوتی تھی۔

میلے کا محل وقوع اور ترتیب

میلے کے زمانہ میں نواب صاحب کا خیام مستقل طور پر باغ بے نظیر کی دو منزلہ کوٹھی میں ہوتا تھا جس کے سامنے ایک گہری اور لمبی چوڑی نہر تھی۔ یہ باغ، کوٹھی اور نہر نواب سید احمد علی خاں صاحب نے شہر رامپور سے تین میل کے فاصلہ پر تعمیر کرائی تھی۔ اکبر شاہ خاں[2] فرحت تخلص نے ان تینوں کے حسب ذیل قطعات تاریخ لکھے ہیں

قطعہ تاریخ تعمیر[3] کوٹھی

بنی خاص کوٹھی عجیب و غریب — کروں وصف کیا اسکی تعمیر کا
ہوا سرد آتی ہے گرمی میں واں — وہ گویا ہے اک باغ کشمیر کا
وہ رنگین چھتیں اور وہ دیوار و در — فدا جس پہ عالم ہو تصویر کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) ممکن ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں تعمیر ہوئی ہو اور اسکا افتتاح، ورنہ پنکھا چڑھانے کی رسم ۱۲۶۹ھ میں ادا کی گئی ہو۔ ورنہ قطعہ تاریخ کو زیادہ صحیح ماننا پڑے گا۔

ع۲ اکبر شاہ خاں نام فرحت تخلص ابن ملا ملوک۔ ملا ملوک دو جوڑے کی جنگ میں رامپور کی طرف سے شریک تھے۔ اکبر شاہ خاں صاحب علم تھے۔ حاجی گل محمد خاں سے نظم میں اصلاح لیتے تھے۔ ایک قلمی دیوان اردو ۱۴۳ صفحہ کا سرکاری کتب خانہ میں موجود ہے۔ ۷۵ برس کی عمر میں ۹ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ کو انتقال ہوا۔

ع۳ ماخوذ از قلمی دیوان اکبر شاہ خاں فرحت موجودہ کتب خانہ سرکاری

صفائی کا کیا اس کی کیجے بیاں — چپ سا ہے واں کام تقریر کا۔
نہ کر دیر لکھ اس کی تاریخ جلد — نہیں کام فرصت یہ تاخیر کا
اٹھا کر سر ہوش زانو سے کہہ
بنا اک مرقع یہ تصویر کا۔

۱۲۳۱ھ ۵ + ۱۲۲۶

قطعۂ تاریخ تعمیر نہر

بنی آگے کوٹھی و دالان کے — عجب نہر پاکیزہ نزہت سرشت
میں تاریخ اس کی جو پوچھی کہی — خرد نے کہ ہے نہر نہر بہشت

۱۲۳۲ھ

قطعۂ تاریخ باغ

ہوئی تعمیر باغ نو جس دم — اور نام اس کا بے نظیر رکھا
دل نے روئے حساب تاریخ — کہی مجھ سے کہ بے نظیر بنا

۱۲۳۳ھ ۸ + ۱۲۲۵

آپ نے تاریخ کے قطعات ملاحظہ فرمائے اب انکی مزید تفصیل جناب تجبر[۲] سے سنئے

---

۲ ماخوذ از قلمی مثنوی متعلق تعریف نواب احمد علی خاں مؤلفہ تجبر تخلص موجودہ کتابخانہ سرکاری (جناب تجبر کے حالات معلوم نہ ہو سکے)

مہینا جب ربیع الاوّل کے آ کر — ہوا روشن سرِ چرخ اوپر
غرض نواب کو اس مہ میں آیا — خیال گلشن راحت فزا کا
شتابی خانساماں کو بلا کے — کہا اپنی زبان درفشاں سے
کرو اک باغ یاں تیار ایسا — کہ ہووے جنت الماویٰ سے اجلا
یہ لے پروانگی پھر خانساماں — طرف مقصد ہوا تشریف فرما
قطب کی سمت کو باہر نگر سے — ہوا میدان اک منظور اس کے
نظارے سے وہ اس میدان کے یکبار — ہوا شاداں بہت وہ مرد ہشیار
بیاں ہووے صفت اس میدان کا کیونکر — کوئی لاوے بھلا اپنی زباں پر
صفائی دیکھو اس میداں کی یکسر — ہے گریاں رشک سے چرخ منور۔
جو وہ میدان نجومی اس طرح کا — بتا یک کیا کہوں جب اس نے پایا
وہیں جلدی نجومی اور برہمن — بلا تحقیق کرتا رتخ احسن۔

باغ

بنا کے باغ رونق بخش ہر دل — کرے برپا، بلا معمار کامل
کہ دیکھا وصف معماروں کا اظہار۔ — ہر اک صنعت میں تھا استاد ہشیار
غرض کچھ چند مدت میں وہ گلزار — ہوا اقبال عالی سے وہ تیار
عجب اس باغ کی تھی راستی لوا — سفیدی میں وہ تھی براق لیپا

منڈیروں پر وہ اس دیوار کی مور
کریں تھے رقص اور کرتے تھے وہ شور

روش تھی ہر طرف اسمیں نمایاں
کہوں کیا میں قرینہ سے عجب ایواں

تھے ہر ہر قسم کے میوے مہیا
عزیزو کیا کہوں اس میں سراپا

چھٹی تھی باغ میں ہر سمت چادر
عجائب لطف سے اللہ اکبر

بنا اس طرح سے گلشن وہ جب تو
خجالت جس سے ہو باغ ارم کو

شتابی منتخب کر نام اس کا
رکھا پھر بے نظیرے راحت افزا

اگر چاہے ہے تو تاریخ اس کی
تو سن بارہ سو اور بتیس ہجری

۳۲ ۱۲ ھ

کوٹھی

ہے اس گلشن میں اک بنگلا کہوں کیا
چمک جس کی یہاں سے تا ثریا

بلندی میں وہ ہے ایسا مقرر
زمیں پر ہے گویا عرش منور

چقیں پردے تمامی زر کے اسمیں
لگے ہیں جا بجا ہر ایک در میں

کہیں ہے نقش زر اسمیں سراپا
کہیں ہے لاجوردی اسمیں ہر جا

ہیں اس میں سائباں زربفت کے کل
رہے ہیں جن کے ڈورے یاقوت میں تل

لگے ہیں بادلے اسمیں کئی واں
کہوں کیا ان کی خوبی کا میں ساماں

ے تعمیر باغ کی تاریخ کا سال فرحت نے ۱۲۳۳ھ تحریر کیا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ سہواً تینتیس کی جگہ بتیس تحریر ہو گیا ہو کیونکہ صرف نقطوں ہی کا فرق ہے۔

اگر وہ ایک بار آپس میں مل جائے　　تو سردی سے وہاں پر چاند گل جائے
سفیدی اس کی گلشن میں ہے اس طور　　طباق سیمیں بیضہ ہو جس طور سے
ہیں اس کی آب سے خجلت میں یکسر　　مہ و خورشید اور انجم سراسر

نہر

ہے اس کے سامنے اک نہر بہتر　　کہوں کیا نہر ہے یا حوض کوثر
بیاں اسکی لطافت کا لکھوں کیا　　سراپا چشمۂ فردوس ہے گا
خنک تاثیر ہے اُس کا آب یارو　　ترا وٹ جس سے ہے ہر ایک دل کو
گر اس میں ایک بار انگشت پڑ جائے　　وہیں اس آب کی سردی سے گل جائے
ہوا ہے اک عجب صورت سے وہ نہر　　دکھاتی سیر ہے اور کھائے ہر لہر
تماشا نہر کا تو اس طرح تھا　　تر اس اوپر اور سنو یہ بات اعلیٰ

بجر

مرصع کشتیاں اسمیں رواں ہے　　کوئی آہستہ اور کوئی دواں ہے
تمامی زر نگو سر سے ہو تیار　　ہوئی تھیں زیب بخش نہر یک بار
غرض وہ باغ بنگلا اور وہ نہر　　بنا جب اس نمط یارو بہ از سحر
ہوا جس دم چمن تیار ایسا۔　　وہیں پھولا خوشی سے خانساماں۔

تجھے چھوڑ یہ مضمون نرالا عیش کہ ہے تجھکو حقیقت اور در پیش
حقیقت یہ کہ وہ سالار عالم چلا پھر سیر کو گلشن کی جس دم

باغ بے نظیر کے چار دروازے تھے شرق رویہ - غرب رویہ جنوب رویہ - شمال رویہ دکھن کی طرف کے دروازے سے نواب صاحب مع جلوس باغ میں داخل ہونے تھے۔ اور اسی دروازے کے پاس سے کوٹھی تک ... اور کوٹھی کے چاروں طرف بجلی۔ کلکتہ اور دلی وغیرہ کی قیمتی سامان کی دوکانیں صف بصف روش بروش قسم دار ہوتی تھیں۔

اس زمانہ میں رام پور تک ریل نہ تھی۔ مراد آباد کے اسٹیشن سے کل سامان گاڑیوں اور مہمان گھوڑا گاڑیوں پر سوار ہو کر رامپور آتے تھے۔ کوٹھی سے پورب کی طرف بہت بڑی اور چوڑی نہر تھی جس کو عہد خلد آشیاں میں اتنا گہرا کر دیا گیا تھا کہ پانی نکل آیا تھا اور درمیان میں جا بجا گہرے کنوئیں بھی کھدوا دیئے گئے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی مد نظر تھا کہ نہر کسی زمانے میں بھی خشک نہ ہونے پائے۔ دوسرے یہ کہ بجرے کے تیرنے میں مدد ملے۔ یہ نہر اب بھی موجود ہے لیکن بعہد نواب جنت مکان پاٹ کر گہرائی کم کر دی گئی ہے۔ کوٹھی اور نہر کے درمیان ایک چھوٹی نہر تھی جس میں فوارے لگے ہوئے تھے۔ اور کوٹھی کے دکھن اور پورب کی طرف پانی کے خزانے کی ایک ٹنکی تھی جس سے فوارے رواں رہتے تھے۔ اس ٹنکی کے پاس ایک دھرمپلن بعہد خلد آشیاں

تعمیر ہوئی تھی جو تقریباً دس بارہ گز اونچی تھی۔ یہ دھر ہرا بالکل سپاٹ اور ڈھلواں تھی۔ میلے کے زمانے میں اس پر ہر وقت تیل ملا جاتا تھا تاکہ چڑھنے والوں کا قدم نہ جمے۔ دھر ہرا کے اوپر سرخ تول کی ایک تھیلی لٹکی ہوتی تھی جس میں پانچ روپیہ اس غرض سے رکھے جاتے تھے کہ جو شخص چڑھ کر تھیلی اتار لے وہ روپیوں کا مالک ہو جائے۔ روزانہ سیکڑوں اس آرزو میں چڑھتے اور چند قدم چل کر پھسل کر اس طرح سے گرتے کہ بعض کے کپڑوں کے پرزے اڑ جاتے اور تماشائی قہقہوں سے داد دیتے۔

اندرون احاطہ باغ کوٹھی کے شمالی و مغربی تختے میں بنوٹ، سیف بانک اور پٹے کے اکھاڑے ہوتے تھے جو دن کے مختلف وقتوں میں اپنے فن کے مظاہرے کرتے تھے۔ آخری دن ہر اکھاڑے کو پچاس روپئے بطور انعام عطا ہوتے تھے۔ کوٹھی سے پورب اور نہر سے پچھم کو دھر ہرا کے قریب نارنگیوں کے تختے میں چار بیت کہنے والوں کی مختلف ٹولیاں دن رات دف پر چار بیتیں گاتی رہتی تھیں۔ آخر دن انہیں سرکاری باورچی خانے سے کھانا تقسیم ہوتا تھا اور چار بیت کے ہر اکھاڑے کو ایک سو روپے انعام عطا ہوتا تھا۔

تعمیری ترمیمات

خلد آشیاں نے کوٹھی میں معمولی ترمیم کی تھی۔ البتہ بڑی نہر سے دکھن کی طرف کوٹھی ولیعہدی۔ پورب میں ایک دومنزلہ عمارت صاحبزادہ سید حیدر علی خاں کے لئے اور ایک دومنزلہ عمارت کوٹھی سے شمال کی طرف صاحبزادہ سید محمود علی خاں کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ کوٹھی بے نظیر کے شمالی اور مشرقی گوشے میں ایک پختہ چبوترہ تعمیر کرایا تھا جس پر شب میں رقص سرود ہوتا تھا۔ اس کے جواب میں کوٹھی کے جنوبی و مشرقی گوشے میں دوسرا چبوترہ بنایا گیا تھا جو نماز کے لئے مخصوص تھا۔ یہ چیزیں اب تک اسی حالت میں ہیں البتہ عہد نواب جنت مکاں میں سابق دھرھسیلن منہدم کرا کر بجائے جنوب کے کوٹھی کے مشرقی دروازے کے قریب دوسری دھرھسیلن بنوا دی گئی ہے اور بڑی نہر کو پٹوا کر گہرائی کم کر دی گئی ہے اور ایک طویل خام نہر کل باغ میں بنوا دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی عہد نواب جنت مکاں میں بدر منیر کی کوٹھی کی مشرقی دیوار توڑ کر دونوں کوٹھیوں کا احاطہ ایک کر دیا گیا ہے۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں دونوں کوٹھیوں کے احاطوں کے درمیان ایک عام راستہ تھا جو اب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعہد نواب جنت مکاں باغ بے نظیر کے جنوبی حصے میں چند باغات شامل احاطہ کر کے باغ بے نظیر میں توسیع کر دی گئی ہے۔ اور

کوٹھی کے جنوبی زینے کو بند کرا کر شمال میں ایک زینہ کوٹھی میں جانے کے لئے تعمیر کرا دیا گیا ہے جس کے آگے برساتی بھی ہے ۔

ان ترمیمات کا ایک نقشہ شامل کیا جاتا ہے تاکہ ہر شے کے مقامات اور ترمیمات کا تعین ہو جائے ۔

بیرون باغ

کوٹھی بے نظیر کی چار دیواری کے باہر مشرقی دروازے سے قدم شریف کی عمارت تک ایک سڑک تھی جو اب بھی موجود ہے۔ سڑک کے شمالی حصے میں مہمانوں کے خیمے نصب ہوتے تھے۔ لیکن خاص خاص امراء و رؤسا کے لئے اندرون باغ خیمے نصب کئے جاتے تھے۔ ایک عظیم الشان خیمہ سڑک کے کنارے پر نصب ہوتا تھا۔ جہاں کل انعامات تقسیم ہوتے تھے۔ اس کے برابر ہی فوجداری کی عدالت کا ایک خیمہ ہوتا تھا۔ اس شمالی حصے میں قدم شریف کی عمارت تک پلٹن اور توپخانے کا کیمپ ہوتا تھا۔ قدم شریف سے پورب کی طرف پہلوانوں کا دنگل ہوتا تھا جو تین دن تک رہتا۔ اور ہندوستان اور ریاست کے مشہور پہلوان کشتیاں لڑتے اور معقول انعام پاتے تھے۔ (ٹکٹ کی رسم نہ تھی) اس کے قریب ہی باغ جگت پور میں تماشہ ہوتا تھا۔ دنگل سے جنوب کی طرف بر تعیتی کے کرتب ہوتے تھے ۔

سڑک کے جنوبی حصے میں باڈی گارڈ اور سواروں کے رسالے ہوتے تھے اسی حصے میں کچھ کھانے پینے کی دوکانیں مختلف قسم کے کھیل تماشے۔ گھومنے والے اڑ کھٹولی دار جھولے ہوتے تھے۔ اور یہیں پتنگ بازی کے میچ ہوا کرتے تھے۔

میلے بھر میں جوے اور شراب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اتنے بڑے میلے کے لئے جہاں لاکھوں آدمی اور جانور ہوتے تھے پانی کا اس طرح انتظام کیا گیا تھا کہ دریائے کوسی سے ایک بڑی شاخ لاکر دو گولیں بنائی گئی تھیں جن میں سے ایک گول اندرون باغ ہر وقت رواں رہتی تھی اور بڑی نہر کو لبریز کرتی ہوئی اندرون میلے کے لئے روش روش کی نالیوں میں رواں رہ کر قدم قدم پر شفاف اور تازہ پانی فراہم کرتی تھی۔ دوسری گول بیرون باغ کے حصے میں ہر وقت رواں رہتی تھی۔ جس کو دیکھکر ہر شخص پکار اٹھتا تھا کہ "باغ باغ جنت ہے چشمہ چشمہ کوثر ہے"۔

حسن انتظام ایسا کہ جواہرات اور سونے چاندی کے انبار دوکانوں میں لگے ہوتے اور دن رات دوکانیں کھلی رہتیں لیکن کسی کی کیا مجال کہ چوری کی نیت سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ قدم قدم پر چوکیدار تعینات رہتے جن کی نگرانی کے لئے لحظہ لحظہ افسران فوج و پولس گشت کرتے رہتے اور ہر دوکاندار کھلی دوکان میں پاؤں پھیلا کر سوتا۔ اسی موقع پر منیر شکوہ آبادی نے کہا ہے۔

رام پور آج کیوں نہ ہو آباد	اس کے طالع نے پائی بیداری
کوئی آنکھیں چرا نہیں سکتا	چور بھولے ہیں اپنی عیاری

میلے کے زمانہ میں بھی نواب صاحب کے اوقات بدستور منظم رہتے۔ علماء اور شعراء وغیرہ کی صحبتیں اپنے اپنے اوقات پر برابر جاری رہتیں کبھی کبھی نواب صاحب بہ نفس نفیس میلے میں خود تشریف لے جاکر سامان حضر دیتے۔ عام طور سے نواب صاحب کوٹھی کی مہتابی ہی سے میلے کی سیر فرماتے تھے اور فنون کے خصوصی مظاہرے کوٹھی کے نیچے کیے جاتے تھے۔

اس میلے کی روح رواں اور تمام تفریحات کا لب لباب میلے کی وہ آخری رات تھی جس میں شام ہی سے چراغاں ہوتا تھا۔ نواب صاحب بجرے میں فروکش ہوکر محفل رقص و سرود کو مزین فرماتے تھے اور سب سے آخر میں آتش بازی کی بہار اپنا جوبن دکھاتی تھی۔

قلعہ معلیٰ کے مغربی دروازے نے جو دردولت[1]

خلد آشیاں کا جلوس

کے نام سے مشہور تھا اور موجودہ صدر کچہری

[1] "دردولت" کی تعمیر نواب خلد آشیاں کے عہد میں ۱۲۸۲ھ میں ہوئی ہے جس کا قطعہ تاریخ سید محمد زکی۔ زکی تخلص نے یہ لکھا ہے۔

ساختہ دروازۂ رفعت نشاں — خسرو نام آور دعرش احتشام
گفت چنیں سال بنایش زکی — ہست در دولت و باب السلام
۱۲ ۸۲ھ

میر محمد زکی نام۔ زکی تخلص۔ والد کا نام سید غلام رضا۔ وطن قصبہ بلگرام۔ مرزا دبیر لکھنوی کے شاگردوں میں بڑے مشاق سلام اور مرثیہ کہنے میں طاق۔ لکھنؤ اور عظیم آباد وغیرہ میں بڑی دھوم دھام کی مجلسوں میں پڑھتے تھے۔ نواب خلد آشیاں کے دربار میں برسوں ملازم رہے۔

اور پولس چوکی کے درمیان کی سڑک کے مشرقی سرے پر واقع ہے۔ سواری کا
جلوس میلے کی شرکت کی غرض سے جا رہا ہے اور اس کا رخ اس سڑک
کی طرف ہے جو دہلی دروازے سے ہوتی ہوئی سیدھی باغ بے نظیر کو جاتی
ہے۔ نواب صاحب سوار ہوتے ہیں۔ ۱۳ توپوں کی سلامی سر ہوتی ہے
سب سے آگے دو شتر سوار باوردی۔ زنبوروں سے مسلح بطور ایڈوانس
پارٹی کے ہیں۔ ان کے پیچھے پانچ سوار۔ سواروں کے بعد ایک گھوڑے پر
نقیب "بڑھاؤ سواری" کے مقررہ الفاظ کہتا اور بلند آواز سے کڑکا کہتا ہوا
جا رہا ہے۔ دوسرے گھوڑے پر ڈنکے والا ایک نقارے پر
مخصوص چوب مارتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ڈنکے کا خاص فائدہ یہ بھی ہے کہ قرب
وجوار کے لوگوں کو جلوس کی روانگی کا علم ہو جائے۔ اس کے بعد چار گھوڑوں کا
چھپرٹ آتا ہے۔ جس پر نواب صاحب سوار ہیں۔ پچھلے پاؤدان پر دائیں طرف
سے مورچھل ہوتا جا رہا ہے۔ بائیں طرف چتر بردار چتر لگائے ہوئے ہے۔ چھپرٹ
کے سامنے کی نشست پر منتخب اشخاص ہیں۔ چھپرٹ کے دائیں طرف افواج
کے جنرل باوردی ہم رکاب ہیں۔ بائیں طرف باڈی گارڈ کے رسالے کے میجر
ہیں۔ ان کے پیچھے باڈی گارڈ کا بے مثال رسالہ ہے۔ جو کمیت گھوڑوں پر سوار

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) پھر دکن کو گئے۔ کئی برس حیدرآباد میں رہے۔ پھر وہاں سے رخصت
لیکر وطن گئے۔ ۱۲ شعبان ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو ۵۰ برس کی عمر میں رحلت کی۔ (ماخوذ از انتخاب یادگار امیر مینائی)

سرخ بانات کی وردیاں زیب تن کئے۔ سر پر چمن سیلور کی جگمگاتی (لندن کی تیار شدہ) ہیلمیٹ ہے۔ زرّیں نوسدان لٹک رہے ہیں۔ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ رواں ہے سالن نقرئی خودوں پر سورج کی کرنیں مچل مچل کر نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی ہیں۔ اس کے بعد چند بگھیوں پر ممتاز ترین اصحاب جن کو شرف ہم رکابی سے نوازا گیا ہے ساتھ ہیں۔

آخر کار جلوس باغ بے نظیر پہنچتا ہے۔ نواب صاحب سواری سے اُترتے ہیں۔ ۱۳ توپیں سلامی کی سر ہوتی ہیں۔ نقیبوں کے دعائیہ کلمات ترقی دولت و اقبال فضا میں گونجتے ہیں۔ اور نواب صاحب کوٹھی باغ بے نظیر میں نزول اجلال فرماتے ہیں اور میلا اپنی پوری آب و تاب اور گرما گرمی کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔

آپ نے طویل سفر کے مختصر جلوس کا ملاحظہ فرما لیا جو چرٹ کی سواری میں طے ہوتا تھا۔ مختصر سفر کا جلوس تخت رواں کی سواری میں پوری فوج وغیرہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ مکمل جلوس کا حال آپ پنکھا چڑھانے کی تقریب میں ملاحظہ فرمائیں گے

اب آپ شعراء کی نغمہ سنجیاں باغ اور کوٹھی کے بارے میں کچھ دیر کے لئے باغ اور کوٹھی کی تعریف مختلف شعراء کرام سے سنکر دل بہلائیں۔ پہلے منیر شکوہ آبادی آپکو باغ کے حالات سے روشناس کرائیں گے۔

باغ

کیا کروں[1] باغ بے نظیر کا وصف — جس سے ظاہر ہے قدرت باری
چھوٹیں آٹھوں پہر ہشتوں کے چھکے — دیکھیں پائیں جو چار دیواری
عطر مجموعہ کی زمین تمام — گرد خوشبو سے مشک تاتاری
رنگ ہر پھول سے ٹپکتا ہے — شاخ ہر گل بنی ہے پچکاری

کوٹھی

اس کی کوٹھی کی کیا بنا کہوں — کی ہے رضواں نے جس کی معماری
دل عارف کی طرح کمروں میں — روشنی نور حق کی ہے ساری
دامن گل کے پھیلنے میں ہے — شفق چرخ کی نمود اری
کہیں گھونگھٹ میں ہے عروس بہار — کہیں مشل بتان آزاری

اب سید ضامن علی جلال لکھنوی کے جذبات عالیہ ملاحظہ ہوں۔

چمن[2] سے تھی فصل بہاری قریب — کہ ناگہ ہوئی نعرہ زن عندلیب
یہ ہے فصل ہنگامۂ بے نظیر — قریب آ گیا موسم دلپذیر

---

[1] ماخوذ از کلیات نظیر اکبرآبادی مطبوعہ ۱۸۷۹ء

[2] از مثنوی شاہد شوخ طبع جلال لکھنوی مطبوعہ ۱۸۸۱ء

یہ سرکار کے ہے مسرت کا وقت — تعیش کا ہنگام عشرت کا وقت
زمانہ ہے نزدیک اب جشن کا — مہیا ہے سامان سب جشن کا
یہ وقت خموشی نہیں اے جلال — مری طرح تو بھی ہے رنگیں مقال
کیا جب یہ بلبل نے مجھ سے خطاب — دیا میں نے خوش ہو کے اسکو جواب
کہ اچھا سن اول مری گفتگو — سراپا ہو گل کی طرح گوش تو
پلا ساقیا بادۂ شوخ رنگ — بنا دے طبیعت کو جو شوخ و شنگ
جو مصرع ہو اک شاہد ناز ہو — ہر اک شعر طاؤس طناز ہو
لکھوں تہنیت نامۂ بے نظیر — کروں وصف ہنگامۂ بے نظیر
بس اب دے کوئی جام مستی فروش — ذرا دیکھ جانی طبیعت کے جوش
یہی طبع کے جوش کا وقت ہے — یہی رخصت ہوش کا وقت ہے
نشاط و طرب کا ہے دل میں ہجوم — تفرج کے سامان میلے کی دھوم
جدھر دیکھتا ہوں کھلا ہے چمن — جدھر آنکھ اٹھتی ہے اک انجمن

باغ

وہ گلشن جسے کہیے باغ نشاط — وہ جلسہ جو سرمایۂ انبساط
وہ گلشن جسے روح پرور کہیں — وہ جلسہ جسے عیش گستر کہیں
وہ گلشن جو محبوب ہر گلعذار — وہ جلسہ جو مطلوب ہر گلعذار

وہ گلشن کہ مطرب جہاں فصلِ گل
وہ جلسہ کہ ساقی جہاں دورِ مُل

وہ گلشن کہ بلبل جہاں رنگ و بو
وہ جلسہ کہ پروانہ ہر شمع رو

وہ گلشن جو رنگیں اداؤں کی زیب
وہ جلسہ کہ زہرہ لقاؤں کی زیب

وہ گلشن جو حورانِ جنت کی روح
وہ جلسہ جو عیش و مسرت کی روح

وہ گلشن جو سب نازنینوں کی جان
وہ جلسہ جو سارے حسینوں کی جان

وہ گلشن جو ہمرنگِ باغِ ارم
وہ جلسہ جو ہم عشرتِ جشنِ جم

وہ گلشن جو گلدستۂ بزم ہے
وہ جلسہ جو رونق دہِ بزم ہے

وہ گلشن جہاں باغ پیرا بہار
وہ جلسہ جہاں جلوہ آرا نگار

وہ گلشن طرب خیز جس کا لقب
وہ جلسہ دلآویز جس کا لقب

وہ گلشن خزاں جس سے سو کوس دور
وہ جلسہ پھرے گرد جس کے سرور

وہ گلشن کھلے غنچۂ دل جہاں
وہ جلسہ مرادیں ہوں حاصل جہاں

یہ ساماں دیکھے نہ تھے دلپذیر
چمن بے نظیر - انجمن بے نظیر

کوٹھی

وہ کوٹھی گلستاں میں عشرت فزا
کہ ہر درجہ جس کا مسرت فزا

بجا ہے اگر عیش منزل کہوں
گلستاں کو سینا اسے دل کہوں -

چمن اس کی زینت پہ زیبِ چمن
گلستاں ہے دولہا تو کوٹھی دلہن

کہاں اس طرح کے صفا خیز قصر
دل آرام۔ دلکش۔ دلاویز سحر

دروں کی یہ صورت کہ سب دل کشا
تماشائیوں سے کہیں مشکل کشا

جو سب عمارت کو جائے نگاہ
تو آنکھو نہیں پھر کہ نہ آئے نگاہ

تماشا کناں جس کی حور جناں
کھلے ہیں فلک پر جھروکے جہاں

دکھاتا نہیں آنکھ کو یہ بہار
فلک کا بھی قصر زبرجد نگار

سفیدی سے اٹھتی ہے لو نور کی
صفا میں چمک جلوۂ طور کی

بجا ہوش رہتے نہیں دیکھ کر
کہ غش کھا کے گرتے ہیں اہل نظر

یہ کوٹھی وہ ہے شاہ بھی جس میں ہے
یہ منزل وہ ہے ماہ بھی جس میں ہے

یہ قیصر ہی سے قصر کی ہے نمود
یہیں بانئ جشن کا ہے ورود

اسی کا لقب منظرِ دل کشا
یہیں ہے وہ خورشید رونق فزا

اسی قصر میں ہے وہ گردوں پناہ
یہی خاص نواب کی جلوہ گاہ

یہیں مجمع اہل دربار بھی
یہیں جمع مشتاق دیدار بھی

یہیں جمع سب شہریار جہاں
یہیں جمع سب ذی وقار جہاں

یہیں آ کے جھکتے ہیں سب سرفراز
یہیں سجدے کرتے ہیں اہل نیاز

اسی در کا دارا ہے اک چوبدار
اسی بزم کا جم ہے خدمت گزار

یہی قصر ہے منزل فیض عام
برستا ہے گنج یہیں صبح و شام

ہزارے یہیں چھٹتے ہیں فیض کے
خزانے یہیں لٹتے ہیں فیض کے

یہیں آکے ناشاد ہوتے ہیں شاد
یہیں بار رکھتے ہیں [illegible]

یہیں عقدۂ مشکل کے ہوتے ہیں حل
یہی خلق کی ہے دعا کا محل

اسی قصر کے گرد میلا تمام
نشاط و طرب کا یہیں اژدحام

اسی قصر کے نیچے بازار ہیں
اسی ذیل میں سب کے انبار ہیں

نہر

دکھاتی ہیں نہریں بھی کیا آب و تاب
جہاں جیسے آئینہ ہو آب آب

وہ پاکیزہ ہے ایک اک آبجو
فرشتے بھی کرتے ہیں جس پر وضو

چھلکتی ہیں نہریں کس انداز سے
ہر اک موج اٹھتی ہے کس ناز سے

عجب شوخ رفتار پانی کی ہے
عجب طرز دلکش روانی کی ہے

صفا خیز نہریں یہ دیکھی نہیں
ادا خیز لہریں یہ دیکھی نہیں

ہوا ہے حبابوں کے اندر بھری
کہ شیشوں میں اتری ہوئی ہے پری

حباب آبجو میں نہیں جلوہ گر
لب جو ہیں روشن چراغ گہر

وہ فواروں کی ہیں گہرباریاں
کہ نیساں بھی ہو پانی پانی جہاں

ہزارے نہیں چھٹتے ہیں بار بار
برستا ہے گلشن میں ابر بہار

اسے آپ منشی امیر اللہ تسلیم کی طبع آزمائی سے مستفید ہوں۔

شروع مہ و سال اجلاس میں ... دم اوج اقبال اجلاس میں[۲]

ا۔ منشی امیر اللہ تسلیم تخلص ابن مولوی شیخ عبدالصمد۔ آپ کے پردادا شیخ نعیم اللہ کو محمد شاہ بادشاہ دہلی نے مقام نوراہی پرگنہ منگل ضلع فیض آباد میں قاضی مقرر کیا جس پر دو دریا پور دو گاؤں جاگیر میں ملے علم و فضل میں یہ خاندان مشہور تھا۔ مولوی عبدالصمد محمد علی شاہ والی لکھنؤ کے عہد میں تحصیلدار رہے ۱۸۴۱ء میں جاگیر رہن کر کے بارہ ہزار روپے سرکار کو ادا کرنا پڑے۔ اور یہیں سے افلاس کی ابتدا ہوئی۔ جناب تسلیم ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ امیر اللہ نام رکھا گیا۔ ۱۵ سال کی عمر میں شاہی پلٹن میں ملازم ہوئے لیکن تعلیم جاری تھی۔ اسی پلٹن میں [illegible] جناب تسلیم کو بھی شاعری کا ذوق انکی صحبت میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں شادی ہوئی شادی کے دوسرے سال والد کا انتقال ہو گیا لکھنؤ میں مطبع مصطفیٰ خاں میں کاپی نویسی کرنے لگے۔ اور جناب نسیم کے شاگرد ہوئے پلٹن سے علیحدگی کے بعد واجد علی شاہ نے ۳۰ ماہانہ مقرر کر دیا۔ واجد علی شاہ کی حکومت ختم ہونے پر بیکار ہو گئے۔ اس وقت منشی لوجن لال نے عہ مقرر کیے۔ اور عہ میں کاپی نویسی کرنے لگے ۱۸۵۷ء میں غدر کی تباہی آئی تسلیم کو بھی یٰسین خاں کی کمپنی میں اسٹنٹ افسر بنا دیا گیا جب ہنگامہ فرو ہوا تو شہر سے بھاگ گئے۔ رامپور کے یعقوب خاں ایک جوان حیدری پلٹن میں ملازم تھے۔ آپ انکے ساتھ رامپور چلے آئے اور [illegible] کرنے لگے [illegible] نواب خلد آشیاں کے دربار [illegible] ہوئے بعد پھر لکھنؤ جا کر کاپی نویسی کرنے لگے جب نواب خلد آشیاں مسند نشین ہوئے تو حضرت امیر مینائی کے ذریعہ بافرما عہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۲۰ جنوری ۱۸۷۲ء کو ناظر عدالت مقرر ہوئے۔ ۲۰ جون ۱۸۸۳ء کو عدالت فوجداری میں پیشکار ہوئے۔ پھر نظارت پر تبادلہ کرا لیا۔ نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد ۱۸۸۹ء میں تعلیم میں نائب انسپکٹر مقرر ہوئے ۱۸۹۹ء میں ریاست سے عہ ماہانہ کی پنشن ہوئی۔ وہاں سے اپنے شاگرد نواب [illegible] کے پاس چلے گئے۔ رامپور میں درخواست پنشن کرنے پر پانچ روپیہ کا اضافہ پنشن میں ہوا ۱۹۱۲ء میں [illegible] برابر اضافہ ہوا۔ نواب حامد علی خاں جنت مکاں نے ولایت کا سفر کیا تو جناب تسلیم نے اس سفر کے حالات بطور مثنوی نظم کیے لیکن یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ سرکار سے غائب ہو گیا۔ دوبارہ پھر نظم کر کے سفرنامہ نذر کیا اس کے صلے میں چالیس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ جناب تسلیم لکھنؤ کو آنکھ بنوانے گئے [illegible] صفحہ ۲۵ ۔

۲۔ ماخوذ از مثنوی تاریخ [illegible] منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی مطبوعہ ۱۲۹۵ھ

خلائق کی بہبود کے واسطے ۔ اسی خاص مقصود کے واسطے
یہ تجویز فرمائی زیب بیان ۔ کہ ہر سال ہو ایک میلا یہاں
رعایا ہو اس سے بھی کچھ کامیاب ۔ اٹھائے مزے عیش کے بے حساب
دکانیں جمیں جنس نایاب کی ۔ بہم ہو خریداری اسباب کی
فزوں ہو دل آسودگی کی امنگ ۔ تجارت دکھائے ترقی کے رنگ

باغ

جو مشہور دو باغ ہیں قرب شہر ۔ تر و تازہ و سبز فردوس بہر
جنہیں بے نظیر اور بدر منیر ۔ زمانے میں کہتے ہیں برنا و پیر
گل و ارغواں سے ہے جس کی زمیں ۔ زیارت گہ باغ خلد بریں
نظر گاہ تک سبزہ سر گراں ۔ پڑا مست لیتا ہے انگڑائیاں
محبت کے عالم میں شبنم مدام ۔ دھلاتی ہے غنچوں کے منہ صبح و شام
گلوں سے ہر رنگ بت نوجواں ۔ صبا کرتی پھرتی ہے اٹکھیلیاں
مذاق تبسم لب گل میں ہے ۔ مزہ درد کا آہ بلبل میں ہے
سمن میں ہیں گلہائے سوسن کھلے ۔ شب و روز ملتے ہیں باہم گلے
اکڑتے ہیں شمشاد طرف چمن ۔ غضب کا ہے جوبن عجب بانکپن
شہ گل کی شاید سواری میں ہے ۔ کہ سورج مکھی چتر داری میں ہے

(بقیہ صفحہ ۲۴) غرض سے گئے تھے ۔ آنکھ بند کی اور ۲۲ رمئی ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ ہی میں انتقال ہوگیا۔ اور خدا یار خاں کے باغ میں دفن ہوئے ۔ تفصیلی حالات کے لئے تذکرہ کاملان رامپور وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

یہاں کی اگر دیکھے رضواں بہار　　کرے ہشت جنت کو صدقے نثار
ہزاروں طرح کے شجر سربلند　　ہمیشہ بر و برگ سے بہرہ مند
شب و روز مانند نخلِ جناں　　ثمر کا نہ کھٹکا نہ بیم خزاں
مکانات شاہی بنے نور کے　　اڑیں دیکھ کر ہوش فغفور کے
گلستاں ہیں کہکشاں کا جواب　　کھنچی دور تک جدول نہر آب
حقیقت میں یہ دونوں بے مثلِ باغ　　زمین و فلک کے ہیں چشم و چراغ
بلایا اراکین ذی جاہ کو　　دیا حکم اعیان درگاہ کو
کہ ہر سال عمدہ سرانجام سے　　یہاں جشن اجلاس کے نام سے
مقرر کرو ایک میلا ضرور　　کسی بات میں ہو نہ اصلا قصور
رہے ہفتے تک مجمع خاص و عام　　خلائق کا ہر طرف ازدحام
نئی طرح آرائش باغ ہو　　جسے دیکھ کر خلد بھی داغ ہو
جو باہر سے احباب آئیں یہاں　　پئے سیر تشریف لائیں یہاں
انہیں جملہ اسباب ہر کام کے　　نشاط و طرب عیش و آرام کے
عنایت کیے جائیں سرکار سے　　زباں آشنا ہو نہ تکرار سے
یہ سنتے ہی ارکان دولت تمام　　ہوئے روز و شب مائلِ انتظام
سجا پیشتر باغ دل خواستہ　　کیا لاکھ صورت سے پیراستہ
کئی دن میں آراستہ کر دیا　　زمانے کے اسباب سے بھر دیا

ذریعے سے اخبار کے اشتہار
روانہ کئے ہر طرف بے شمار

خبر سن کے یہ تاجران جہاں
گھروں سے چلے کارواں کارواں

ہوا جب کہ غنچوں سے پیدا ابھار
نکھرنے لگی نو عروس بہار

کھلے جوش میں سوئے طرف چمن
گل و لالہ و نرگس و یاسمن

ہوئے آپ جاہ و حشم سے سوار
چلے سوئے باغ ہمیشہ بہار

کوٹھی

اس کوٹھی کو دیکھکر ہر طرف
کیا فیض مقدم سے بیت الشرف

میلا

مچی دھوم میلے کی ہر صبح و شام
ہوا چار سو خلق کا اژدہام

گڑے خیمے صدہا وہ میدان میں
جو افلاک سے کم نہ تھے شان میں

ہزاروں رئیسان والا تبار
امیران ذی مرتبہ بے شمار

ہر اک شہر نامی کے ارباب فن
ہنر پیشہ و تاجران زمن

یہ سب آئے مشتاق دیدار کے
ہوئے خاص مہمان سرکار کے

مقرر کئے اوج مراتب کی شان
عنایت کئے سب کو خیمہ مکاں

شب و روز شام و سحر غور سے
ہوا کی مدارات ہر طور سے

تماشائیوں کی یہ کثرت ہوئی | کہ نظروں کو پھرنے میں دقت ہوئی
پڑا پشت پر بار خلق اس قدر | کہ گاؤ زمیں کا ہوا شق جگر
ہوئی گرم باہم خرید و فروخت | مٹی ہر زیاں تجارت کی سوخت
جو تھے تاجران سفر آزما | ہوئے منتفع آرزو سے سوا
دکانیں ہوئیں خالی اسباب سے | بھرے کیسے سیم و زر ناب سے
کیا طرہ اس پر یہ سرکار نے | خدیو جہان و جہاں دار نے
تجارت کی نسبت دیا حکم صاف | کہ تھا جو محصول ہم نے معاف
وہ بے مثل تھا ہر طرف انتظام | کہ بے خوف چوروں سے ہر خاص و عام
دکانیں شب و روز ہوتیں نہ بند | پہنچتا کسی کو نہ کوئی گزند
تماشا نئی طرح کا ہر کہیں | ٹھہرتیں نگاہیں نہ دم بھر کہیں۔
کہیں جلسہ یاران دمساز کا | کہیں مشغلہ نغمہ و ساز کا
کسی سمت بازی گروں کا ہجوم | کہیں بانک لکڑی بنیٹی کی دھوم

درخت پاکھٹ

چونکہ باغ کا ذکر ابھی آچکا ہے اس لئے جی نہیں چاہتا کہ نواب صاحب کی نوادر پسندی کے ایک واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ منشی محمد اسمٰعیل خاں صبر تخلص بیان کرتے ہیں کہ نواب صاحب کو اتفاقاً حکیم محمود خاں صاحب

دہلوی سے معلوم ہوا کہ لال قلعہ دہلی میں ایک ایسا درخت ہے جس کا پھل جگر، معدہ اور تلی کی اصلاح کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور ہندوستان میں یہ ایک ہی درخت ہے۔ پھر کیا تھا نواب صاحب اس درخت کے اوصاف سنتے ہی بے چین ہو گئے اور ہزار جتن کر کے زرِ کثیر صرف کرنے کے بعد اس درخت کا ایک پودا باغ بے نظیر میں نصب کرا کے ہی چھوڑا۔ یہ درخت پاکھر کا بیان کیا جاتا ہے لیکن آج کل عام طور سے پاکھٹ کے نام سے مشہور ہے۔ نہد خلد آشیاں اور اس کے کچھ مدت بعد تک اس درخت کے نیچے پہرا رہتا تھا اور اس کے پھل خاص خاص اشخاص کو تقسیم کئے جاتے تھے۔ اس کا پھل نادونی آڑو کی برابر یا اس سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ اس کا استعمال مربے کے چٹنی یا مربے کی صورت میں کیا جاتا ہے اس کے اندر سے سخت چیپ دار لعاب نکلتا ہے جس کا ہاتھ سے دور کرنا مشکل ہوتا ہے اس کا کل درخت کوٹھی بے نظیر کے موجودہ جنوبی پل کے قریب ہے جو کوٹھی ولی عہدی سے جنوبی و مغربی گوشے کی طرف واقع ہے۔ اس درخت سے پودے تیار کرنے کی ہر زمانے میں کوشش کی گئی لیکن کوئی پودا قائم نہ رہ سکا۔

اب کوٹھی[1]، باغ اور میلے کے عام حالات کے بارے میں حضرت امیر مینائی کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔ عبارت کا وہی مقفیٰ رنگ ہے جو اس زمانے میں مقبول تھا اور یہی رنگ معیارِ قابلیت متصور ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں

"آغاز زمانۂ جلوس میمنت مانوس میں ایک روز خیال آیا کہ کوئی میلا

---

[1] ماخوذ از انتخاب یادگار

اس شہر میں ایسا مقرر کیا جائے کہ وہ بھی نفع عام کا رنگ دکھائے شہر سے تھوڑے سے فاصلے پر جانب شمال دو باغ ہیں کہ وہاں نہ گل کے دامن میں خار، نہ لالے کے دل میں داغ ہے ۔

منور ہیں راتوں کو ایسے وہ باغ   کہ ہر لالہ تر ہے روشن چراغ
تنِ تاک عالم عجب نور کا ۔   ثریا ہے ہر خوشۂ انگور کا
جو گل ہے گل روئے معشوق ہے   جو سنبل ہے گیسوئے معشوق ہے
مسافر جو آ نکلے سوئے چمن ۔   اڑیں ہوش ایسے کہ بھولے وطن
نظر کرتے ہی دل سمن چھین لے   سمن سے بچے نسترن چھین لے
فراغت جو نظارۂ گل سے ہو   رہائی کہاں دام سنبل سے ہو

وہ دونوں باغ اشجار بوقلموں سے لبریز، ریاحین گوناگوں سے مسرت خیز۔ بسان دل ہائے اہل کرم وسیع ۔ برنگ ہمت ارباب ہمم رفیع پختہ چار دیواری محاط کوٹھیاں ۔ وہاں کے مرکز دائرہ نشاط بے نظیر اور بدر منیر ان باغوں کا نام ہے ۔ درحقیقت باغ بے نظیر ہے ۔ کوٹھیوں کا ہر قبہ ماہ تمام ہے حکم ہوا کہ جشن جلوس کے نام سے وہاں ہر سال ایک میلا قرار دیا جائے اور سامان آرائش باغ کے علاوہ تہیہ اسباب صادرین و واردین سرکار عالی سے کیا جائے ۔ کارپردازان چابکدست نے مرضی حضور کے موافق باغوں کو آرائش ہائے بوقلموں سے دلہن کی صورت آراستہ کر دیا ہزاروں لاکھوں روپیے کے سامان سے بھر دیا ۔ بذریعہ صحائف

اخبار اشتہار جاری ہو گئے۔ تاجران جوار و دیار سوداگران بلاد و امصار اس
مژدۂ جاں بخش سے بہ تمنائے حضوری محو بے قراری ہو گئے۔ فصل نوروزی میں
کہ زمان آغاز بہار و جوش گل و گلزار ہے۔ بندگان اقدس بذات خاص وہاں
جلوہ افروز ہوئے۔ دور دور کے مشتاقین مہمان ہو کر مائدۂ فیض سے بہرہ اندوز
ہوئے۔ جو رئیس، شریف، امیر، غریب آیا۔ حضور کی پرورش و پرداخت سے
اس نے عجب لطف اٹھایا۔ تماشائیوں، نظارگیوں، دوکانداروں، خریداروں
کی کثرت سے گزر دشوار رہا۔ اقمشہ و امتعہ کے وفور سے ہر بازار رشک فرخار ہوا
تاجروں کو بنظر رفاہ عام محصول معاف فرمایا۔ خریداروں سے دکانداروں کو قرار واقعی
نفع ہاتھ آیا۔ از صبح تا صبح مستقل دکانیں کشادہ رہتی ہیں۔ زر و گوہر کی ہر طرف
نہریں بہتی ہیں۔ کبھی کسی کا نقصان نہیں ہوتا ہے۔ حسن انتظام سے ایسا امن ہے
کہ ہر شخص راتوں کو بے کھٹکے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ قصہ مختصر سال اول جلوس
میمنت مانوس سے یہ میلا ہر سال ہوا کرتا ہے۔ عیش مدام و عشرت دوام کو
اس جشن میں دور دورہ رہا کرتا ہے۔ اس میلے کی بدولت بھی نفع عام اور رفاہ انام
کا ظہور ہے۔ اگر کوئی اسے مبالغہ جانے اس کی فہم کا قصور ہے۔ سارا شہر
اعلیٰ سے ادنیٰ تک اس میلے میں آتا ہے۔ سال بھر کا رنج ہر ایک کے دل سے
نکل جاتا ہے۔ ایک نہر باغ بے نظیر میں بہت عریض و طویل جوش لطافت سے
رشک کوثر و سلسبیل ہے۔ وہ پانی سے لبریز ہوتی ہے۔ فوارے کی ہر شاخ

اس میں گہر ریزی ہوتی ہے۔ آٹھ نو دن یہ میلا اس تکلف اور آرائش سے رہتا ہے
ایک دریائے عیش باغ میں چار طرف بہتا ہے۔ شب آخر کثرت چراغاں سے
زمین رشک آسمان بن جاتی ہے۔ نہر کے گرد قمقمہ ہائے رنگ رنگ کی روشنی
نظارگی کو حیرت سے آئینہ بناتی ہے۔ یہ کیفیتیں دیکھکر انسان کے ہوش گم ہو جاتے
ہیں۔ تماشائی بے تکلف آپ میں آتے ہیں۔ آتش بازی اس کثرت سے چھوٹتی ہے
کہ چشم نظارہ زمین پر ہمارا انجم لوٹتی ہے۔

اب باغ اور میلے کے کچھ حالات تاج الاخبار ۲۳ مارچ ۱۸۷۶ء (جس کے
مالک امیر مینائی تھے) سے نقل کرکے برائے ملاحظہ پیش کئے جاتے ہیں۔

"باغ جناں سے اس میں فزوں ہے جنس عیش
میلے میں بے نظیر کے ارزاں ہے جنس عیش

آج کل باغ بے نظیر کے جوبن کا دل لوٹ ہے ..... باغ کا تختہ تختہ
مثل خانۂ عروس مہک رہا ہے۔ تماشائیوں کے ہجوم میں ہر روش پر مثل
خندۂ گل کٹھ را کھنک رہا ہے۔ جو امرا ذرو سا میلے کی سیر کے واسطے دور دور سے
تشریف لائے ہیں۔ اُن کے واسطے اور نیز عمائد شہر کے لئے خیام فلک احتشام
استادہ ہیں۔ حضور پُرنور دام اقبالہم و ملکہم و دولتہم کی طرف سے مہمان نوازی کے
سامان وسعت خوان خلیل سے زیادہ ہیں۔ حضور پرنور بھی اکثر اوقات کوٹھی پر
دُوربین سے سیر فرماتے ہیں۔ جو سائل دور دور عرضیاں لئے کھڑے ہوتے ہیں

جو سائل و زائر و درد عرضیاں لئے کھڑے ہوتے ہیں بنظر الطاف و ترحم ہرکارہ بھیجکر منگواتے ہیں۔ اتنے بڑے میلے میں انتظام کی یہ خوبی ہے کہ اگر کسی کی سوئی بھی گر جائے تو جہاں گرے وہیں پائے۔ باغ اور خیموں کے گرداگرد دس دس قدم پر چوکیدار پہرا دیتے ہیں۔ سڑکوں پر گشت کے سوار ایک لمحہ دم نہیں لیتے ہیں۔

اب بازار اور دکانوں کا کچھ حال مختلف شعراء سے سنئے۔

بازار اور دُکانیں

حضرت جلال لکھنوی کا ارشاد ہے۔

کہاں ایسے بازار آئیں پسند — دکانیں ہیں ایسی کہاں دل پسند
جو بازار ہیں یوسفستان حسن — دکانیں نظر آتی ہیں کان حسن
سجاوٹ دکانوں کی ایسی پری — کہ سو جان سے ہر نگہ مشتری
کبھی ایسے سوداگر آئے نہ تھے — کبھی مال تاجر یہ لائے نہ تھے۔

گراں پایہ ہیں جتنے اسباب ہیں — سب اشیاء، و اجناس نایاب ہیں
کبھی تھیں نہ ایسی خریداریاں — نہ ہر جنس کی گرم بازاریاں ”
ہر اک شے جواہر کے تولوں بکی — ہر اک چیز یوسف کے مولوں بکی
کسی مال کا مایۂ جان تھی مول — کسی جنس کا نقد ساماں ہے مول
کوئی چیز وہ جس کی قیمت ہو دل — سمجھتا ہے مفلس غنیمت ہے دل ؎

کسی سمت بزّازہ آراستہ — کسی سمت صرافہ پیراستہ
کہیں جوہری ہیں لگائے دکاں — دوکانیں ہیں انکی جواہر کی کاں

دوکانیں کہیں شیشہ آلات کی — جہاں رنگ شوخی خیالات کی ہے
نہ دیکھے تجھے یہ شیشہ پُربہار — نہ کی تھی کبھی سیر مینا نگار ہے
وہ جلوہ دکھاتی ہیں مرزنگیاں — کہ بھولی نگہ اپنی نیرنگیاں
ضیا بار ایسے مصفا کنول — کھلا ہو نور روشن ہو دل کا کنول
صفا خیمہ سب آئینے نور کے — دل آویز سب جھاڑ بلور کے
کہیں جلوہ آرا وہ مینائے سبز — فلک عکس سے جن کے ہو جائے سبز
کہیں شیشۂ سرخ پرتو فگن — بنا دے جو میلے کو گل پیرہن

حلوائی

کہیں ہیں وہ بے مثل حلوا فروش — سمجھئے جنھیں من و سلویٰ فروش
بیاں کیجئے کیا مٹھائی کا لطف — دکھاتی ہے شیریں ادائی کا لطف
جلیبی مزے شیرۂ جاں کے دے — اگر امرتی کھالے امرت نہ لے
پری حور سے کتنے نزاکت سرشت — پسند آئے حوروں کو وہ دربہشت
جو قند مکرر میں آیا مزہ ہے — وہ شیریں لبوں میں نہ پایا مزہ

باورچی

لگائے ہوئے ہیں کہیں مطبخی ؔ ۔ دکانیں طبق ہائے نعمات کی
چنی ہیں وہاں نعمتیں بے شمار مزعفر ۔ متنجن ۔ مربے اچار
کبابی جہاں بھونتے ہیں کباب وہیں آکے پیتے ہیں میکش شراب
کبابوں کی گرمی میں کیا گفتگو کہ بے چین کر دیتی ہے جنکی بو ؔ

مالن

کہیں پھول والوں کا بازار ہے وہاں کی ہوا تک بھی گلبار ہے
نرالی ہے ستبو نیا موتیا عجائب ہے جوہی عجب موگرا
چنبیلی کی کثرت ہے بیلے کا جوش وہیں پر زیادہ ہے میلے کا جوش

عطر فروش

دکانیں کہیں دور تک عطر کی بساتی ہے کپڑے مہک عطر کی
کسی عطر میں ہے گل تر کی بو ۔ کسی عطر میں سنبل تر کی بو ۔
کسی بو پہ مائل نسیم چمن ؔ کسی بو پہ عاشق شمیم چمن ۔
کوئی نکہت ایسی کہ لیجائے ہوش کسی بو سے بیہوش کو آئے ہوش

تنبولن

تنبولن بھی بیٹھی ہے اک شوخ و شنگ — جمائے ہوئے مثلِ پان اپنا رنگ
یہ سر سبزیِ حسن کا حال ہے — زباں جس کی تعریف میں لال ہے
جسے وہ گلوری بنا کر کھلائے — وہ خود قفل کا اپنے بیڑا اٹھائے

ساقن

کسی سمت ساقن کے جوبن کی ہوا — تماشا ہوں کا اسی جا ہجوم
بلند ایک صفّہ وہاں نور کا — کھنچا اس پہ اک سائبان نور کا
وہ شوخ پری رو وہیں جلوہ گر — ادھر کچھ چھلکاتی سبیں کچھ ادھر
جسے بھر کے حقّہ پلاتی ہے وہ — دھوئیں اس جواں کے اڑاتی ہے وہ

صحبت شعر و سخن

اس میلے کی خصوصیات میں ایک صحبت شعر و سخن بھی تھی جو میلے کے پانچویں دن منعقد ہوتی تھی۔ بیرونی مخصوص شعرا کو بھی دعوت سخن دی جاتی تھی۔ اس صحبت میں شعرا اپنے بلند پایہ کلام سے بزم سخن کو قابلِ یادگار بناتے تھے۔ آخر دن بیرونی شعرا کو حسب مرتبہ رخصتانہ مرحمت ہوتا تھا اور سرکاری مہمان رہتے تھے۔

بیرونی شعرا کے علاوہ جو درباری شعرا شرکت کرتے تھے اُن کا حال

منیر شکوہ آبادی سے سنئے :-

مجمع شاعران نامی ہے " شاعری کی ہے گرم بازاری "
بحر[1] - منشی اسیر[2] اور امیر[3] ہمسر انوری و مختاری

---

[1] شیخ امداد علی بحر تخلص - ابن شیخ امام بخش - ناسخ کے شاگردوں میں ناموَر تھے - کلیات مطبوعہ ہے حسب بیان انتخاب یادگار سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں ان کی عمر ۶۵ سال تھی - خمخانہ جاوید کا بیان ہے کہ عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا - آخر عمر میں نواب خلد آشیاں نے دستگیری کی - اور رامپور بلاکر فکر معاش سے آزاد کر دیا - عروض میں اچھی دستگاہ تھی - ۷۵ سال کی عمر پاکر سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں انتقال کیا مدفن کا کوئی ذکر نہیں ہے - تاریخ ادب اردو اور تاریخ نظم و نثر اردو دونوں متفق ہیں کہ ان کا انتقال رامپور میں ہوا تذکرہ گل رعنا مدفن کے بارے میں خاموش ہے البتہ لکھنؤ کا دبستان شاعری تحریر کرتا ہے کہ عرصے تک بحر کا قیام رام پور میں رہا لیکن آخر عمر میں اپنی خواہش سے اور وطن کی محبت سے نواب خلد آشیاں سے رخصت ہو کر لکھنؤ چلے آئے تھے اور لکھنؤ ہی میں سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں انتقال ہوا - غرض ۷۵ سال کی عمر اور سنہ ۱۳۰۰ھ میں وفات سے تقریباً سبھی کو اتفاق ہے - البتہ تاریخ نظم و نثر اردو نے سال وفات ۱۸۸۴ء تحریر کیا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا - رام پور میں تحقیق کرنے سے بھی بحر کا انتقال رام پور میں ثابت نہیں ہوا - اس لیے دبستان شاعری لکھنؤ کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے -

اسیر[2]

منشی مظفر علی - اسیر تخلص - ابن سید مدد علی [illegible] قصبہ امیٹھی میں جو مضافات ملک اودھ سے ہے پیدا ہوئے بچپن میں لکھنؤ آ گئے - فارسی کی کتابیں اپنے والد سے اور عربی کی تکمیل علمائے فرنگی محل سے کی - ۸ سال غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں ۴ سال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷) امجد علی بادشاہ اودھ کے عہد میں اور ۴ سال واجد علی شاہ کے عہد میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ تدبیر الدولہ، مدبر الملک بہادر جنگ خطاب پایا۔

ریاست رامپور میں بعہد نواب سید محمد سعید خاں جنت آرامگاہ ملازم ہوئے۔ نواب سید یوسف علی خاں ناظم خلد مکاں کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں دوبارہ ریاست میں ملازم ہوئے۔ فن شعر میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے نامی شاگرد ہیں فن عروض میں یگانۂ عصر تھے۔ تفصیلی حالات دوسرے تذکروں میں ملاحظہ ہوں۔

ریاست کے کتب خانے میں مندرجہ ذیل داستانیں حضرت اسیر کی تصنیف سے موجود ہیں

(۱) طلسم باطن بالا باختر

(۲) طلسم باطن آفات

(۳) طلسم عنبر کیہ

(۴) طلسم نادر فرنگ

(۵) طلسم باطن نیرنجات

(۶) طلسم نرکیان

(۷) ترجمہ لعل نامہ

حضرت اسیر کی تاریخ وصال وفات اور مدفن کے اختلافات قابل غور ہیں۔ خمخانۂ جاوید سال وفات ۱۲۹۹ھ عمر ۸۴ سال اور مدفن رامپور تحریر کرتا ہے۔ تذکرہ گل رعنا بھی سال وفات ۱۲۹۹ھ تحریر کرتا ہے۔ مدفن کے بارے میں خاموش ہے۔ البتہ تاریخ ادب اردو نے تحریر کیا ہے کہ حضرت اسیر سے طے ہوا تھا کہ ۶ ماہ رام پور میں رہیں گے اور چھ ماہ لکھنؤ۔ ان کا انتقال جب ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) میں ہوا تو اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ تاریخ نظم و نثر اردو سے بھی لکھنؤ ہی مدفن ثابت ہوتا ہے اور سال وفات ۱۳۰۰ھ۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری سال وفات ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱-۱۸۸۲ء) تحریر کرتا ہے۔ اس طرح سال عیسوی میں تقریباً کل تذکرے متفق ہیں

عمر کے متعلق تھا۔ جاوید نے ۸۴ سال تحریر کئے ہیں اور تاریخ ادب اردو نے ۸۱ سال میں۔ سلسلے مزید تحقیق کی غرض سے جب اخبار "دبدبہ سکندری" رامپور مطبوعہ ۲۳ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۸۲ء جلد ۱۸ کے صفحہ ۱۲ کو دیکھا تو یہ اعلان ملا کہ "اودھ" اخبار میں یہ حادثہ دردناک دیکھ کر کمال صدمہ ہوا کہ ۷ فروری ۱۸۸۲ء کو منشی سید مظفر علی خاں اسیر نے قضا کی۔ گویا شاعری کا چراغ گل ہو گیا۔

اس تحقیق سے نہ صرف تمام اختلافات سال ہجری و عیسوی ختم ہو گئے بلکہ صحیح تاریخ و ماہ وفات کا بھی تعین ہو گیا۔

حضرت امیر مینائی

امیر احمد نام۔ امیر تخلص ابن مولوی کرم محمد مینائی، ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ کو نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ مینا صاحبؒ کی اولاد سے ہیں۔ فرنگی محل میں علوم فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ شاعری میں مظفر علی خاں اسیر سے استفادہ کیا اور درجہ بلند پایا۔ ۱۲۶۹ھ میں فضل و علم کی بدولت واجد علی شاہ کے دربار میں داخل ہوئے۔ ۱۲۷۴ھ میں غدر نے لکھنؤ کا تختہ الٹ دیا۔ اور صاحبان فضل و کمال کا شیرازہ ٹوٹ گیا تو ۱۲۷۶ھ میں نواب سید یوسف علی خاں ناظم تخلص فردوس مکاں نے رامپور طلب کر لیا۔ عدالت دیوانی کے مفتی مقرر ہوئے۔ نواب خلد آشیاں نے آپ سے شعر و سخن میں مشورہ شروع کیا۔ استاد کے لقب سے اعزاز حاصل ہوا۔ رہنے کے لئے سرکاری مکان عطا ہوا۔ جو ابھی تک انکی اولاد کے قبضے میں تھا۔ نواب خلد آشیاں کے آخر عہد میں امیر اللغات کو شروع کیا۔ جس کا سلسلہ نواب عرش آشیاں کے عہد تک جاری رہا۔ الف مقصورہ اور الف ممدودہ کی صرف دو جلدیں شائع ہوئی تھیں کہ حضرت امیر نے ۱۳۱۸ھ میں ۱۰ جمادی الاول کو

حیدرآباد دکن کا عزم کیا۔ حیدرآباد پہنچکر علیل ہوگئے اور ۱۹ رجمادی الآخر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد میں انتقال فرما گئے۔ شاہ یوسف حسین اور شاہ شریف کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے

عروج

احمد حسن خاں نام۔ عروج تخلص۔ ابن منشی محمد حسن خاں۔ قصبہ آسیون ضلع لکھنؤ کے شیوخ سے تھے۔ فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ دلّی اور لکھنؤ میں زیادہ قیام رہا۔ آخر میں کانپور سکونت اختیار کی۔ ۱۲۸۵ھ میں نواب خلد آشیاں کی قدردانی رامپور کھینچ لائی۔ ایک سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ہوئی۔ عربی کے فاضل تھے۔ فارسی میں بھی استاد کامل تھے۔ خوش نویسی نستعلیق میں بھی اعلیٰ دستگاہ تھی۔ شیخ امام بخش ناسخ اور میر علی اوسط رشک سے اردو کلام میں استفادہ کیا تھا۔ ایک زمانے تک دلّی کی ریزیڈنسی میں بھی ملازم رہ چکے تھے۔ رامپور میں ۱۰ جنوری ۱۸۷۶ء کو رجسٹرار کی خدمات تفویض ہوئیں۔ پھر مصاحبین سے تعلق رہا۔ ان کا مکان رامپور کے محلہ دو مجلے میں سڑک کے کنارے پر مدرسہ "اصلاح قوم" جہاں ہے بجانب مغرب تھا۔ رامپور سے بیمار ہوکر کانپور گئے اور ۱۳۱۲ھ میں وہیں انتقال کیا۔

داغ دہلوی

۱۲۴۶ھ
۱۸۳۱ء نواب مرزا خاں داغ تخلص۔ ابن نواب شمس الدین احمد صاحب ۱۲ ذی الحجہ کو بمقام شاہجہان آباد محلہ بلّی ماران میں پیدا ہوئے۔ علوم و فنون کی تکمیل قلعہ معلّیٰ دہلی میں ہوئی۔ صاحب عالم مرزا ولیعہد بہادر نے آپکو ذوق کا شاگرد کرا دیا۔ اس وقت ۱۱-۱۲ سال کی عمر تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء سے دس ماہ پہلے ۱۸۵۶ء میں ولیعہد بہادر کے انتقال کے بعد صدمہ پہنچا۔ ۱۰ ماہ کے بعد غدر ہوا تو نواب مرزا مع خاندان کے رامپور چلے گئے۔

نواب یوسف علی خاں نے سایۂ عاطفت میں لیا۔ اس کے بعد نواب خلد آشیاں نے بھی وہی مدارات جاری رکھی۔ ان کا ابتدائی تقرر ۱۴۔ اپریل ۱۸۶۶ء کو ہوا۔ ۲۲ سال تک مصاحبت کے ساتھ مختلف صیغوں کی خدمات انجام دیں۔ خلد آشیاں کی نظر میں انکی بہت زیادہ عزت تھی۔ اور ان پر بھروسہ کرتے تھے چونکہ بچپن میں نواب مرزا داغؔ اور نواب سید کلب علی خاں کا عرصے تک ساتھ رہا ہے۔ اس لئے بچپن کے خلوص کو نواب خلد آشیاں نے تادمِ آخر بڑی وضعداری سے نبھایا۔ حضرت داغ کے پڑھنے کا انداز انوکھا اور نرالا تھا۔ حضرت داغؔ کا قیام رامپور میں تقریباً ۲۴ سال رہا۔ خلد آشیاں کے ہمرکاب حج کعبۃ اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ نواب خلد آشیاں کے انتقال کے ایک سال بعد ہی ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد گئے۔ متعدد خطابات سے نوازے گئے۔ آخر حیدرآباد ہی میں بعارضہ فالج ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو انتقال کیا۔ یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے۔

جلالؔ لکھنوی

حکیم سید ضامن علی صاحب۔ جلالؔ تخلص۔ ابن حکیم اصغر علی صاحب لکھنؤ میں پل آہنی کے پرلے پار محلے میں ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں تعلیم پائی۔ فارسی بدرجۂ کمال اور عربی کم پڑھی تھی کہ نظم اردو کا شوق ہوا۔ میر علی اوسط رشکؔ کے شاگرد ہوئے۔ سخن طرازی کے شوق میں عربی کی بھی تکمیل کی۔ فن عروض میں گویا ان کے مثل نہ تھا۔ تحقیقات لغت میں بھی کامل تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں نواب یوسف علی خاں ناظم نے رامپور طلب فرمایا۔ خلد آشیاں کے عہد تک دربار کا زیور رہے۔ دربار میں علی سکا

اور زبان کی تحقیق میں سب سے زیادہ ہی نوک جھونک کرتے تھے نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد شیخ حسین سیار مصاحب مانگرول نے بلا لیا اور ۵۰ روپے کا وظیفہ گھر بیٹھے مقرر کر دیا۔ نواب حامد علی خاں جنت مکاں نے اپنے عہد میں طلب فرما کر تنخواہ جاری کر دی۔ حضرت جلال کا قیام رامپور میں زیادہ تر ملا ملوک کے گھر میں رہا۔

ان کی تصنیف سے ایک داستان "بال باختر" سرکاری کتب خانے میں موجود ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء / ۱۳۲۷ھ کو ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔

گل رعنا تاریخ نظم و نثر اردو اور خمخانہ جاوید نے ۷۶ سال کی عمر لکھی ہے اور اس کی بنیاد خمخانہ جاوید کے بیان کردہ سال ولادت سنہ ۱۲۵۱ھ پر رکھی گئی ہے جو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ "انتخاب یادگار" کی رو سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں حضرت جلال کی عمر ۴۴ سال تھی۔ اور یہ عمر یقیناً حضرت جلال کے بیان کے مطابق حضرت امیر مینائی نے تحریر کی ہوگی۔ لہذا سنہ ۱۳۲۷ھ میں ۸۱ سال کی عمر ہونا چاہیئے۔ اور اس حالت میں سال ولادت سنہ ۱۲۵۱ھ کے بجائے سنہ ۱۲۴۶ھ صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔

حیا دہلوی

صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا تخلص ابن صاحب عالم مرزا کریم الدین رسا نبیرۂ شاہ عالم ثانی۔ دلی کے لال قلعہ میں سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ سخن آفرینی میں باکمال تھے۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ ریاست رامپور میں مع اہل و عیال سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

غدر سنہ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے بنارس کے سفر کے سلسلے میں نواب سید یوسف علی خاں ناظم فردوس مکاں کے مہمان رہے۔ اور غدر کے بعد دلی سے رامپور آئے۔ نواب خلد آشیاں نے قدر دانی کی اور اپنا مصاحب بنا لیا۔

مرزا جیاؔ کے چھوٹے بیٹے مرزا ولی الدین عرف مسمرزا المحسن۔ عمر ۶۹ سال ساکن محلہ احاطہ دارہ ملازم بزمرہ شطرنج بازان سے معلوم ہوا کہ مرزا جیا ۱۸۵۵ء میں رامپور آ گئے تھے۔ کوچہ لنگرخانہ میں صاحبزادہ سید حیدر علی خاں کے مکان کے متصل رہتے تھے۔ مرزا جیاؔ کا انتقال نواب خلد آشیاں کی وفات سے ۸ روز بعد ۵ رجب ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۸۶۵ء کو رامپور میں ہوا اور صاحبزادہ سید محمود علی خاں کے باغیچے میں متصل شفاخانہ صدر دفن ہوئے۔

مرزا جیاؔ کے بڑے بیٹے کا نام علیم الدین تھا جو نواب سید حامد علی خاں جنت مکاں کے عہد میں بزمرہ داستان گویاں ملازم تھے۔ ان کے مکان پر ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد داستانگوئی کا جلسہ ہوتا تھا۔ ان کا انتقال ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء میں رامپور میں ہوا۔ مرزا علیم الدین کی تصنیف سے مندرجہ ذیل داستانیں سرکاری کتب خانے میں موجود ہیں۔

(۱) بہارستان

(۲) تورج نامہ

(۳) طلسم نہ طاق سکندری۔

(۴) داستان امیر حمزہ جدید مسمی بہ بہارستان شمال

(۵) داستان طلسم باطن ہوش ربا۔

(۶) طلسم باطن ہوشربا دوسوم بہ داستان طلسم لازال

(۷) طلسم حکیم آذر کیوان

(۸) طلسم معدن الغرائب

(۹) طلسم لاانزاند

(۱۰) طلسم چاہ زمرد

شاغلؔ دہلوی

آغا مرزا شاغل دہلوی۔ ابن آغا تراب علی۔ حضرت داغ دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ نہایت خوش فکر تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ریاست رامپور میں رہے اور سرکاری ملازم تھے۔ مزاج میں استغنا تھا۔ مشاعروں میں غزل خوب پڑھتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی حضرت داغ کے شاگرد تھے۔ انتخاب یادگار میں ان کی عمر ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں ۴۴ سال تحریر ہے۔ خمخانۂ جاوید بعمر ۴۴ سال انتقال تحریر کرتا ہے۔ مدفن کے بارے میں خاموش ہے۔ اس بیان سے ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں انتقال ثابت ہوتا ہے۔ صبر امروہوی کا بیان ہے کہ مرزا شاغل کا انتقال رامپور میں ہوا اور وہ حکیم احسن صاحب کے مکان کے متصل قبرستان میں دفن ہوئے۔

صباؔ سہسوانی

منشی سید صابر حسین نام صباؔ تخلص۔ ابن محمد احتشام الدین صدیقی سہسوانی ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ریاست بھوپال میں ناظم ضلع مشرقی تھے۔ عربی و فارسی کے بخوبی ماہر تھے۔

علم عروض و فن بدائع میں اچھا دخل تھا۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مولوی نجف علی خاں اور اردو میں مولوی ایوب علی خاں گلشن اور شیخ علی بخش بیمار سے تلمذ تھا۔ تاریخ گوئی میں اچھا ملکہ تھا۔ نواب خلد آشیاں کی تعریف میں ایک مثنوی شوکت جعفری لکھی تھی۔ جس کے صلے میں خاطر خواہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۳۱۳ھ میں بعمر ۶۰ سال انتقال ہوا۔ (ملاحظہ ہو خمخانۂ جاوید) مدفن کے متعلق خمخانۂ جاوید خاموش ہے۔ اخبار الصنادید کے بیان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ صباؔ ریاست رامپور کی ملازمت ترک کرکے بھوپال واپس چلے گئے تھے۔ درمیان میں آغا سنجر کے ساتھ ایک مرتبہ بھوپال سے رامپور آئے تھے لیکن چار سو روپے رخصتانہ لیکر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد رامپور آنا ثابت نہیں۔ ممکن ہے کہ بھوپال میں انتقال ہوا ہو۔

بدرؔ شاداںؔ، غمیںؔ غنیؔ ہر دم　　رہتے ہیں مدح خوانِ سرکاری

بشیرؔ لکھنوی

خواجہ محمد بشیر نام۔ بشیرؔ تخلص۔ ابن خواجہ نظام الدین احمد ولد سید شاہ حسین مودودی۔ وطن قدیم شاہجہاں آباد۔ پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ کتب درسیہ عربی مختلف استادوں سے پڑھیں۔ فارسی کی کتابیں مولوی فخرالدین خاں شاہجہاں پوری سے پڑھیں۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں انکی عمر حسب بیان انتخاب یادگار ۶۵ سال کی تھی۔ سرکاری ملازم تھے۔

خواجہ بشیر کے انتقال اور مدفن کا حال کسی تذکرے میں نہیں ملا۔ البتہ اخبار دبدبۂ سکندری رامپور مطبوعہ ۵ رجب ۱۲۹۶ھ مطابق ۲۴ جون ۱۸۷۹ء میں خواجہ بشیر کے انتقال سے متعلق یہ اعلان ملا کہ "خواجہ محمد بشیر صاحب نے جو زمانہ سلطنت اودھ میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے تھے بعدہٗ کچھ عرصے تک ریاست رامپور سے متعلق رہا۔ ۳ جون ۱۸۷۹ء کو بروز پنجشنبہ در دولت کدہ لکھنؤ میں انتقال کیا۔　　(دیکھو اخبار کارنامہ مطبوعہ ۷ جون ۱۸۷۹ء)

بدرؔ

سید ابو محمد نام۔ بدرؔ تخلص۔ ابن منشی سید محمد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی۔ منیرؔ شکوہ آبادی کے تعلق کی وجہ سے عہدِ خلد آشیاں میں سرکاری ملازم ہوئے۔

بدرؔ کے حالات کی تحقیق کے سلسلے میں تمام تذکرے چھان مارے لیکن ان کا حال کہیں نہ ملا۔ انتخاب یادگار کی جس نے رامپور کے البتہ تمام شعرا کے نام لکھے ہیں۔ بدرؔ کے بارے میں خاموش پایا۔ مجبوراً حضرت آرزو لکھنوی، حضرت صفی لکھنوی اور حضرت مولانا حسرت موہانی کی طرف رجوع کی گئی۔ لیکن محرومی بدستور رہی۔ مشکل یہ تھی کہ نام تک کا علم نہ تھا۔ لیکن منیرؔ شکوہ آبادی کے حوالے کو بھی غلط تصور کرنا ناممکن تھا۔ حسن اتفاق کہ ایک روز کلیات منیرؔ مطبوعہ ۱۲۸۹ھ کے قطعات تاریخ میں ایک ایسے قطعے پر نظر پڑی جس کے عنوان میں جلی حروف میں

" قطعہ تاریخ سید ابو محمد بدر والد مصنف تحریر تھا۔ قطعہ یہ ہے۔

چوں کلام والدم مطبوع شد　　　گشت جوشاں قلزم معراج نظم

عیسوی تاریخ طبعش گفت بدرؔ　　　طبع زیبا۔ روح معنی تاج نظم

۱۸۶۹ء

لیکن حالات کی تحقیق ہنوز تشنہ تھی۔ اگرچہ تلاش کے تمام ذرائع جواب دے چکے تھے۔ لیکن دُھن لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے سید محمد محسن صاحب ہلال تخلص ابن سید ابو محمد بدر تخلص سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بیان کیا کہ جناب بدرؔ کی چار اولادیں تھیں۔ ایک لڑکا۔ تین لڑکیاں۔ دو لڑکیاں غیر شادی شدہ انتقال کر گئیں۔ ایک لڑکی کی شادی اعجاز حسین صاحب افغان پوری سابق سب انسپکٹر آبکاری رامپور سے ہوئی۔ سید محمد محسن صاحب کی عمر اب ۶۰ سال کے قریب ہے۔ جناب بدرؔ کے انتقال کے وقت اُن کی عمر چھ مہینے کی تھی۔ انھیں کل حالات اپنی والدہ سے معلوم ہوئے۔ جناب بدرؔ رامپور کی عدالت دیوانی میں حسکم نویس بھی رہے ہیں۔ ان کا انتقال تقریباً ۴۲ سال کی عمر میں ۱۸۹۱ء میں رامپور میں ہوا اور تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

شاداںؔ[۱۲]

مرزا حسین علی خاں نام۔ شاداںؔ تخلص۔ پسر خورد نواب زین العابدین خاں عارفؔ برادرزادہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ وطن دلّی۔ رامپور میں بوجہ تعلق مرزا غالبؔ ملازم ہوئے۔ ان کے شاگرد زیادہ تھے۔ فارسی میں خیالی اور اردو میں شاداںؔ تخلص کرتے تھے۔ طبیعت دقت پسند اور فکر بلند تھی۔ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں ۲۵ سال کی عمر تھی (انتخاب یادگار، شعرائے دربار)۔ تیس روپیہ ماہانہ پاتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد ساٹھ روپے ماہانہ ملنے لگے تھے۔ آخر زمانے میں مالیخولیا اور وہم کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اسی مرض میں انتقال ہو گیا۔ مولانا حالیؔ اور نواب مرزا ازبان علی بیگ سالکؔ سے مشورہ سخن کیا۔ تذکرہ خمخانۂ جاوید ان کا

انتقال ۷۲ سال کی عمر میں تحریر کرتا ہے۔ اس طرح ان کا سال وفات ۱۲۹۳ھ ہوتا ہے
صابر میاں کا بیان ہے کہ رامپور کے تکیہ شاہ رفیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

غمین

مرزا معین الدین حیدر نام۔ غمین تخلص۔ ابن مرزا تاج الدین حیدر لکھنؤ وطن۔ سرکاری ملازم تھے۔ مرزا کلب حسین خاں عرف مرزا خانی نوازش کے شاگردوں میں ممتاز تھے۔

انتخاب یادگار میں ۱۲۹۰ھ میں ان کی عمر ۵۰ سال تحریر ہے۔ مرزا غمین کے حالات میں کل تذکرے خاموش ہیں۔ انتہائی تلاش و تحقیق کے بعد مرزا غمین کی ایک پوتی کا علم ہوا۔ جو بقید حیات زندہ ہیں۔ انکی عمر ۸۵ سال ہے تفصیلی ذکر آغا غنی کے سلسلے میں آئے گا۔ ان سے معلوم ہوا کہ مرزا غمین ان کے دادا غدر کے بعد رامپور آئے۔ پہلے رامپور کے محلہ کٹ کویا میں صاحبزادہ علی صاحب کے مکان کے قریب نسیم محمد دلشنے کے مکان میں کرایہ پر رہے۔ مرزا غمین نواب زادگان کے استاد اور اتالیق تھے۔ ان کا انتقال نواب خلد آشیاں کے انتقال سے تین سال پہلے یعنی ۱۳۱۴ھ میں بعمر ۸۰ سال رامپور میں ہوا۔ اور طوطی والے مقبرے میں دفن ہوئے۔

غنی

آغا علی نقی نام غنی تخلص، ابن مرزا معین الدین حیدر غمین۔ امیر مینائی انتخاب یادگار میں تحریر کرتے ہیں۔ "کہ بیس برس کی عمر میں خوش گوئی کا عالم دکھایا۔ اچھا پڑھنے لگے گویائی کا حسن اور بڑھایا۔ بڑے ذکی و ذہین۔ بڑے مضمون آفریں ہیں۔ نثر و نظم سب میں قوت اچھی ہے۔ منشی سید تفضل حسین منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہیں۔"

حکیم سید الیاس صاحب طبیب سرکاری اور منشی محمد یار خاں صاحب ریٹائرڈ ناظم ہائیکورٹ رامپور سے معلوم ہوا کہ آغا غنی امیر مینائی کے اخبار "تاج الاخبار" کے ایڈیٹر تھے۔ عدالت فوجداری

ناظر بھی رہے۔ انسپکٹر نیلام اور ریاست کے متعدد صیغوں میں ملازم رہے ہیں کسی وجہ سے جیل کے حوالات کر دیئے گئے تھے۔ اس کے دوسرے ہی سال جیل میں انتقال ہوا۔

ہم نے تحقیق مزید کی غرض سے اخبار دبدبۂ سکندری رامپور کی کثیر جلدیں دیکھیں۔ بالآخر ۸ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ جون ۱۸۸۵ء کے اخبار سے اتنا پتہ چلا کہ آغا غنی بوجہ چند بے اعتدالیوں کے عہدۂ میراخباری سے برطرف کئے گئے۔ برطرفی اور حوالات کے مفصل حالات اخبار دبدبۂ سکندری مطبوعہ ۷ شوال ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۸۸۵ء میں صفحہ ۱۰ پر تحریر ہیں۔

آغا غنی کی اولاد میں صرف ایک بیٹی ہیں جنکا نام نواب بیگم ہے اور عرف بن آپا ہے۔ انکی عمر اب ۷۵ سال کے قریب ہے۔ ۵ سال کی عمر سے نابینا ہو گئی تھیں۔ مذہباً اہل سنت والجماعت سے ہیں۔ محلہ بہربان کی مسجد کے عقب میں رہتی ہیں۔ انھوں نے بسلسلۂ تحقیق بیان کیا کہ آغا غنی نے اہل سنت ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور میرزا غنی اپنے والد سے علیحدہ مکان میں جو محلہ احمد آر کے گھیر (بہرخاں میں) تھا رہنے لگے تھے۔ کچھ مدت کے بعد مرزا غنی اپنے بیٹے آغا غنی کو اپنے مکان میں لے آئے تھے جو میاں نعیم شاہ صاحب کے مزار کے قریب واقع تھا۔ آغا غنی کا انتقال بھی مسلک اہل سنت پر ہوا۔ جب آغا غنی کا جنازہ جیل سے مکان پر آیا تو میاں نجاں جو بیٹوں کے استاد نے اپنی آراضی میں جو کچی چھپانی کے تھانے سے ایک سو قدم کے فاصلے پر ایک مسجد سے ملحق ہے دفن کیا۔ انتقال ۱۸۸۰ء میں نواب خلد آشیاں کے انتقال سے ایک سال پہلے ہوا۔ انکی عمر اسوقت ۳۳ سال کی تھی اور آغا غنی کی بیٹی کی عمر ۵ سال تھی۔ انکی کل پرورش اپنی والدہ اور حیدر حسین صاحب سے جنھیں آغا غنی نے بچپن سے پالا تھا معلوم ہوئے۔ نواب بیگم صاحبہ کی قوت حافظہ غیر معمولی پائی گئی۔

نثار

آغا محمد شیرازی نثار تخلص۔ ابن علی بابا شیرازی بشہرت تخلص سنہ ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء میں انکی عمر

فن تاریخ میں رساؔ[1] منصورؔ جانؔ صاحب کی ریختی پیاری

۲۶ سال کی تھی۔ سنجیدہ و زیرک تھے۔ اپنے والد کے شاگرد تھے۔ دربار ریاست میں بعہد خلد آشیاں ملازم تھے۔ (انتخاب یادگار) اخبار الصنادید سے اتنا مزید پتہ چلا۔ کہ نثار نواب خلد آشیاں کا فارسی دیوان "تاج فرخی" برائے اصلاح مرزا محمد تقی خاں سپہر ملقب بہ لسان الملک مستوفی اول سلطنت ایران مولف ناسخ التواریخ کے پاس لیکر ایران گئے تھے اور ۱۲۹۴ھ میں ایک قصیدہ ایران سے نواب خلد آشیاں کی مدح میں لیکر آئے تھے۔ اس کے بعد کے حالات باوجود تلاش دریافت نہ ہو سکے۔

رساؔ رامپوری

سید احمد علی نام، رساؔ تخلص۔ رامپور وطن۔ ابن سید امام الدین صاحب جن کے دادا سید محمود علی صاحب بخارا کے رہنے والے تھے۔ ان کے اعزا اکبرآباد و حیدرآباد میں سکونت پذیر ہیں۔ مولوی سید محمود علی صاحب کا سلسلہ نسب ساتویں پشت میں حضرت امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ جناب رساؔ شاعری میں شیخ علی بخش بیمارؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اور بلحاظ ذہانت ان کا تخلص استاد نے رساؔ تجویز کیا تھا۔ نواب خلد آشیاں نے اپنے دربار میں جگہ دیکر مصاحب بنا لیا تھا۔ تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تاریخ اچھی کہتے تھے۔ وارستہ مزاجی اور آزاد طبعی کی وجہ سے کلام مرتب نہیں ہوا۔ جناب رساؔ کی آٹھ اولادیں تھیں۔ سات بیٹے

---

[1] اس شعر میں لفظ "رساؔ" کے دو مطلب لئے جاسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ فن تاریخ میں "منصورؔ" رساؔ یعنی کامل ہیں دوسرے یہ کہ فن تاریخ میں رساؔ اور منصورؔ رہیں۔ پہلے تو دوسری شق کے تحت تحقیقات شروع کی تھی جس کا نتیجہ عرض کر دیا گیا۔ لیکن تحقیقات کے بعد یہی ثابت ہوا کہ لفظ "رساؔ" سے مراد کامل ہے۔ اور اس سے مراد صرف مولانا منصور رحمۃ اللہ علیہ ہیں کیونکہ سید احمد علی رساؔ رامپوری کو خاص شہرت فن تاریخ گوئی میں نہیں پائی تھی۔

سید اسد علی۔ سید محمد علی۔ سید منور علی۔ سید مہدی علی۔ سید اکبر علی۔ سید فدا علی
اور سید عابد حسین ادیب تخلص جو اپنے والد کے شاگرد تھے۔ سید علی حسین
آج کل ان کے بیٹے سید منصور علی عرف زاہد میاں ہیں جن سے یہ حالات معلوم ہوئے۔

جناب رسا صوفی منش تھے۔ سماع سے بھی ذوق تھا۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ حلیہ یہ تھا: گھنی داڑھی۔ رنگ گورا۔ گول چہرہ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ستواں ناک۔ قد میانہ۔ دوہرا جسم مائل بہ فربہی۔ لباس میں اکثر ڈھیلا پاجامہ۔ کرتا۔ زیر ناف نیم آستین کا انگرکھا اور سلیم شاہی جوتا استعمال کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں نے ان کی غیر مستطیع اولاد کا وظیفہ بھی جاری کر دیا تھا۔

جناب رسا کے سال انتقال اور عمر میں تذکرے مختلف البیان ہیں۔ [illegible] کا بیان ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں ان کی عمر ۸۶ سال کی تھی۔ ان کا انتقال ۲۰ شوال ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) کو بمقام لکھنؤ ہوا۔ دلیل میں مولوی عبد الاعلیٰ مدراسی فروغ تخلص کا قطعۂ تاریخ پیش کیا ہے۔

تاریخ او نوشت فروغ از سر الم   احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود

۱۲۹۱ + ۱ = ۱۲۹۲

لیکن اس کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے حوالے سے ۱۳۰۹ھ سال وفات کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ زاہد میاں نے ۱۳۰۶ھ سال انتقال ظاہر کیا۔ ان اختلافات نے مزید تحقیق کا موقع دیا۔ چنانچہ اخبار دبدبۂ سکندری کے انتہائی بوسیدہ اوراق کے صبر آزما مطالعہ کے بعد مجھے ۱۱ محرم ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۸۹۱ء سے جلد ۲۶ کا اخبار دستیاب ہو گیا۔ جس میں تحریر ہے کہ "جناب میرزا احمد علی رسا نے ۷ محرم ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۸۹۱ء کو بروز پنجشنبہ انتقال کیا۔ عمر شریف جناب مرحوم کی تقریباً ۷۰ سال تھی۔ خوش خلق، خوش اوقات، آزاد منش بزرگ تھے۔ شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد تھے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ تسلیم لکھنوی کا بتایا ہوا سال وفات ۱۳۱۹ھ ہی صحیح ہے مزید تحقیق سے اتنا فائدہ اور ہو گیا کہ ان کی عمر اور تاریخ و ماہ وفات کا بھی تعین ہو گیا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ خمخانۂ جاوید کی تحقیقات غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اب آپ تذکرۂ شمع انجمن کی عبارت کے کچھ حصے کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس سے یہ گتھی پورے طور پر سلجھ جائیگی۔

"منشی احمد علی لکھنوی رسا تخلص جامع علوم و اخلاق بود و در نظم و نثر فارسی فکرش رسا و سنجیدہ۔ چہار دیوان فارسی از وے یادگار و بہ طولانش در خوشنویسی سر آمد روزگار مشق سخن در ابتدا از طالب علی خاں عیشؔ و محمد حیات بشتاب نمودہ۔ قبل ایام غدر ہندوستان از ملازمت سرکار انگریزی دل برکندہ و وظیفہ افزا لیہ آں سرکار دخارج شدہ در وطن طرح اقامت برافگندہ بتاریخ بستم شوال ۱۲۹۲ھ در شہر لکھنو بروضۂ رضوان شتافت۔ تلمیذ رشیدش مولوی عبدالعلی مدراسی متخلص بہ فروغ تاریخ وفاتش چنیں یافت

احمد علی رسا کہ بدار البقا رسید | استاد غمگسار من پر ملال بود

تاریخ او نوشت فروغ از سر الم | احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود"

۱۲۹۱ + ۱ = ۱۲۹۲

اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ تاریخ میر احمد علی رسا لکھنوی کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ اس کا کوئی تعلق میر احمد علی رسا رامپوری سے نہیں ہے۔ چونکہ مولوی عبدالعلی مدراسی مدلول

ؔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالعلی مدراسی نے بزمانہ ملازمت سررشتۂ تعلیم رامپور اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیم مولوی محمد شیر زماں خاں صاحب المتوفی بہ ماہ جولائی ۱۹۳۱ء کی تعریف میں مندرجہ ذیل رباعی تحریر کی تھی۔

ذات آمد رستم دوراں ہم شیر زماں بدید | وصفت آمد چشمۂ فیضان ہم بحر رواں

ذات و وصف تو بایں سہر و صفت موصوف باد | تا درخشد شمع بزم و تیغ رزم اندر جہاں

(مولوی محمد شیر زماں خاں صاحب جناب جمشید جہاں بیگم صاحبہ کے جن کے نام سے اس تالیف کا انتساب کیا گیا ہے' نانا تھے۔)

رامپور کے سررشتہ تعلیم میں ملازم رہے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ اس اشتباہ کو زیادہ تقویت ان کی سکونت رامپور سے ہوئی ہو۔ اس نئی تحقیق سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جناب رسا رامپوری کی قبر حضرت شاہ جمال اللہ صاحب کے احاطۂ مزار کے دروازے سے بجانب گوشۂ شمال و مغرب واقع ہے۔ جناب رسا کی تصنیف سے ایک داستان موسوم بہ کہانی "چار شاہزادہ" سرکاری کتابخانے میں موجود ہے۔

منصور

اصل نام سید زین العابدین عرف منصور علی۔ والد کا نام سید حسن علی۔ نانا مولانا ہاشم صاحب تھے جن کے یہاں پرورش پائی۔ میاں رفیع الدرجات صاحب نزہت تخلص سے تعلیم حاصل کی۔ فارسی و اردو دونوں نظم میں پوری قدرت تھی۔ فارسی میں علی تخلص کرتے تھے اردو میں منصور۔ تاریخ گوئی میں ان کا جواب نہ تھا۔ مادۂ تاریخ پر طبیعت اتنی قادر تھی کہ سوال کرنیوالے کا سوال پورا نہیں ہوتا تھا کہ مادۂ تاریخ بتا دیا جاتا تھا۔ مولانا سے بیعت تھے درویش تھے مخلوق سے کسی چیز کے طالب نہ تھے۔ نواب فردوس مکان ولیعہدی کے زمانے سے دس روپے ماہانہ دیا کرتے تھے۔ وہی ان کے لئے کافی تھے۔ اپنے ماموں مولوی محبوب علی صاحب سے بیعت تھے۔ دکھاوٹ سے بچنے کی غرض سے داڑھی کو ہر وقت کپڑے سے چھپائے رکھنا ان کی وضع میں داخل ہو گیا تھا۔ ردا اوڑھتے تھے۔ ایک پشت قبا ایک تسبیح اور پیتل کی چھوٹی سی تختی ہاتھ میں رہتی تھی جس پر انگلی سے کلمہ لکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں۔

اور منصور سب کہانی ہے ذکر کر لا الٰہ الا اللہ

ظاہری زینت سے نفرت تھی چھ چھ مہینے گزر جانے پر بھی کپڑے نہیں بدلتے تمام عمر

عبادت میں گزار دی۔ نکاح نہیں کیا۔ جب لوگوں نے نکاح پر مجبور کیا تو اپنا قطعہ پڑھکر سنایا

بنامرادی این عمر وکے رسیدہ من | برون ز گلشن و از آشیان ہمی مانم
دگر ز حالت آزادیم چہ می پرسی | کہ در محلۂ آزاد خاں ہمی مانم

رامپور میں ایک محلّہ "محلّہ آزاد خاں" کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا نے چوتھے مصرعہ میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولانا کچھ عرصے تک پرانی کھنڈسار کے محلے میں رہے۔ پھر محلّہ آزاد خاں میں۔ آخر میں اپنے نانا کے مکان سے متصل اپنے ذاتی مکان واقع محلہ گویا تالاب میں رہنے لگے تھے۔ اور آخر دم تک یہیں رہے۔ اب مکان کا ذکر آ گیا ہے تو اس مکان کا ایک واقعہ بھی سن لیجیے

ایک دفعہ نواب خلد آشیاں مولانا کے مکان پر تشریف لے گئے تو مولانا کو ایک بوسیدہ کھپریل کے کچے مکان میں چٹائی پر بیٹھا ہوا پایا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس خستہ مکان میں آپکو مقیم دیکھکر بہت تکلیف ہوئی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپکا مکان جلد سے جلد پختہ تعمیر کرا دوں۔ اس لئے آپ یہ مکان کل ہی خالی کر دیں۔ مولانا نے کہا کہ میں اس مکان کا تنہا مالک نہیں ہوں بلکہ میرے شریک اور بھی ہیں اس لئے جب تک کل شریک آمادہ نہ ہوں میں کس طرح اجازت دے سکتا ہوں۔ جب نواب صاحب رخصت ہونے لگے تو اصرار کیا کہ آپ اپنے کل شریکوں کو ساتھ لیکر رات ہی میں میرے پاس آ جائیں تاکہ شریکوں کو منہ مانگی قیمت ادا کر دی جائے۔ نواب صاحب یہ کہکر رخصت ہو گئے۔ مولانا مجبور تھے کہ وعدہ کرنے کے بعد نہ جانا بھی مناسب نہیں۔ آخر رات ہوتے ہی خورشید منزل کا رخ کیا۔ نواب صاحب نے دور ہی سے دیکھکر فرمایا کہ مولانا آپکے شریک کہاں ہیں۔ انھیں فوراً بلائیے تاکہ میں خود بات کر لوں۔ مولانا کچھ دیر تو چپ رہے۔ پھر کہا کہ میرے شریک کسی طرح آنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور نہ مجھے اتنی طاقت تھی کہ ساتھ لے آتا۔

فرمایا۔ اچھا۔ نام بتایئے تاکہ پولس کے ذریعے طلب کروں۔ یہ سنکر مولانا بولے کہ میرے شریکوں کے نام یہ ہیں۔ اگر آپ ان کو بلا سکتے ہو تو بلا لیجیئے۔ مگر یاں، رتیب، کالا، لکڑیاں، چڑیاں، چوہے وغیرہ یہ سب میرے شریک ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو دعویٰ ہے۔ کہ یہ گھر ہمارا ہے۔ نواب صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ تو مولانا نے عرض کیا کہ نواب صاحب بس مجھے میرے ہی حال پر چھوڑ دیجیئے۔ میں اپنے شریکوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے پختہ مکان کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنے ساتھیوں کی تکلیف گوارا کروں چنانچہ یہ مکان برسات میں گرنے لگا تو جس طرف کا حصہ گر جاتا اس کے دوسرے حصے میں جا کر بیٹھ جاتے۔ یہاں تک کہ کل مکان گر گیا۔ نہ کسی کو محلہ اٹھانے سے روکا۔ نہ کسی سے مکان کی مرمت کو کہا۔ ایک حاضر باش نے گھر کے آنگن میں چھپر ڈلوا دیا تو اسی میں رہنے لگے اور وہاں سے مرکر ہی اٹھے۔

مولانا کی یہ حالت تھی کہ کبھی ایک ایک سال تک گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ کبھی نکلتے تو رات دن شہر اور جنگل میں گشت کرتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے تو نواب صاحب کے بلانے پر بھی صاف انکار کر دیتے۔ مولانا کے یہاں حاضر باشوں کا دربار لگا رہتا تھا۔ زبان فارسی و اردو کی تحقیق میں شعر و شاعری اور فقہ و تصوف پر اکثر گفتگو رہتی۔ آخر یہ بزرگ ہستی ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۰۶ھ کو دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ آپ کا مزار خسرو باغ سے مشرق اور شمال کی طرف مولانا رستم علی صاحبؒ کے مزار کے متصل ہے۔ مولانا کے ایک معتقد مولانا عبدالرزاق خاں صاحب طالب تخلص نے جو مؤلف کے استاد تھے حسب ذیل تاریخ لکھی ہے۔

سال و مہ یوم رحلت منظور

دو بدو۔ یک بیک۔ علی منظور

۲۲ - ۱۱ ۱۳۰۶ھ

ایک بار مولانا اپنے گشت کے زمانے میں اپنے میلے کچیلے لباس میں رامپور کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں چلے گئے۔ چونکہ مقام مشاعرہ بڑے اہتمام اور تکلفات سے سجایا گیا تھا اور بکثرت امرا معززین اور مشاہیر مدعو تھے اس لئے مولانا کے میلے کپڑے دیکھ کر منتظم مشاعرے نے کہا کہ "ایسی جگہ اور یہ میلے کپڑے" تم نے مشاعرے کی شان کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ مولانا کو یہ فقرے ناگوار ہوئے اور بحالت ناراضی یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے آئے

گرد آلود ہے گو پیرہن اپنا لیکن — بوریا ہوں نظر میں نہیں کمتر اکسیر
تجھ سے کہتا ہوں کہ تو محو خود آرائی ہے — خاکساران جہاں را بحقارت منگر۔
زچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

مولانا کے کلام کی خصوصیات میں سب سے زیادہ اہم سجع اور تاریخ گوئی ہے۔ اس موقع پر دو تین تاریخوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

رامپور میں جب موتی مسجد بعہد نواب محمد سعید خاں جنت آرام گاہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں تعمیر ہوئی تو نواب صاحب کو اس کی فکر ہوئی کہ حسین شان کی مسجد ہے اسی کے لائق تاریخ ہونا چاہئے۔ غرض اعلان کا ہونا تھا کہ تاریخیں پیش ہونے لگیں لیکن ان تاریخوں کے انبار میں نواب صاحب کے مذاق کے مطابق کوئی تاریخ نہ نکلی۔ نواب سید یوسف علی خاں ناظم اس زمانے میں ولیعہد تھے۔ وہ بھی کوشش کر رہے تھے لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ اتفاق سے مولانا کے ایک حاضرباش کو بھی اس کا علم ہوا۔ اس نے مولانا سے سب واقعہ بیان کیا۔ اور ولیعہد بہادر کے حوالے سے کسی تاریخ کی استدعا کی۔ مولانا نے فرمایا۔ کہ کہہ دینا کہ منصور کے نزدیک اس مسجد کی تاریخ "خانۂ خدا" سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ "خانۂ خدا" کے عدد ۱۲۶۱ھ ہیں۔ جب ولیعہد کی وساطت سے یہ تاریخ نواب جنت آرامگاہ تک پہنچی تو پھڑک گئے اور بے حد خوش ہوئے۔ تاریخ لیجا لیگئے

اس عام میں فوج کا ایک اعزازی عہدہ عطا کیا اور قیاس یہ ہے کہ نواب فردوس مکاں سے دس روپیہ ماہانہ وظیفہ اسی موقع پر جاری کیا ہو۔

دو ایک مثالیں اور ملاحظہ فرمائیے۔ جب نواب خلد آشیاں کے وزیر مولوی محمد عثمان خاں کا جامع مسجد کے ہنگامے میں قتل ہوا تو ایک حاضر باش نے مولانا کو بھی خبر کی۔ مولانا نے فرمایا۔ کیا اچھا ہے " رخصت " لفظ رخصت کے عدد (۱۲۹۰) ہوتے ہیں یہی مادۂ تاریخ ہے

اسی طرح ایک شخص نے ۱۲۹۱ھ میں حاضر ہو کر کہا کہ ہاں! میرے خالو کا انتقال ہو گیا ہے۔ تاریخ کہہ دیجئے۔ ابھی سوال پورا نہیں ہوا تھا کہ فرمایا " خالو خالہ " یہی مادۂ تاریخ ہے

اب میں تاریخ کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس سے ان کی تاریخ گوئی کے کمال کا اور بھی زیادہ معترف ہونا پڑتا ہے۔ جب صاحبزادہ سید حیدر علی خاں برادر خورد نواب سید کلب علی خاں خلد آشیاں کا ایک عالی شان محل نقش و نگار سے آراستہ ہو کر تیار ہوا تو انھیں مکان کی شان کے مطابق ہی تاریخ کی ضرورت ہوئی۔ مولانا سے بھی التجا کی گئی۔ کچھ دیر سوچ کر فرمایا بھائی اس مکان کی تاریخ تو سعدی نے تقریباً سات سو برس پہلے کہہ دی ہے

" نگار خانۂ چینی و نقش ارژنگی "

اس تاریخ میں پہلا مصرع اپنا شامل کیا یعنی

بحرف معجمہ سعدی بگفتہ تاریخش   نگار خانۂ چینی و نقش ارژنگی

پہلے مصرع میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مصرع تاریخ کے نقطہ والے حروف کے عدد جمع کر لئے جائیں تو سال تعمیر ۱۲۹۱ھ نکل آئے گا۔

جان صاحب

جان صاحب کے حالات [illegible] کے سلسلے میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔

سب سے بڑھکر نیرؔ کو حاصل   ہے کمالی و ہرزہ گفتاری

نیرؔ شکوہ آبادی

منشی سید محمد تفضل حسین نیرؔ تخلص - ابن سید محمد حسین شاد - وطن شکوہ آباد - پہلے شیخ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد ہوئے - پھر میر علی اوسط رشکؔ کو کلام دکھایا - جملہ اقسام شعر میں کامیاب تھے - مجموعہ اشعار کی تعداد ۲۰ ہزار کے قریب ہے - خوش خلق - نیک طینت طباع اور ذہین تھے (انتخاب یادگار) لکھنؤ کا دبستان شاعری لکھتا ہے کہ ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے - تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی اور عمر کا بڑا حصہ یہیں گزرا - لکھنؤ سے نکل کر والی باندہ کے ملازم ہوئے - غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ایک قتل کی سازش میں مقدمہ قائم ہونے پر کالے پانی کی سزا ہوئی - ۱۸۶۰ء میں قید سے رہا ہوئے - آخر میں نواب خلد آشیاں کے دربار میں ملازم ہوئے - امیر مینائی کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء سے ایک سال قبل ملازمت رامپور کا سلسلہ شروع ہوا -

جدید تحقیق کے سلسلے میں دریافت ہوا کہ نیرؔ شکوہ آبادی کی تصنیف سے ایک انشاء موسوم بہ طلسم گوہر بار (نگارندہ بالا باختر) سرکاری کتب خانہ میں موجود ہے - جناب نیرؔ کے صرف ایک بیٹے تھے جن کا نام ابو محمد اور تخلص تنویر تھا - ان کے حالات پہلے لکھے جا چکے ہیں - جناب نیرؔ رامپور کے محلہ کٹرہ جلال الدین میں رہتے تھے -

نیرؔ شکوہ آبادی کے سال انتقال اور عمر کے بارے میں تذکرے باہم مختلف ہیں - تاریخ ادب اردو میں "رامپور" مدفن تحریر ہے - ۱۲۹۹ھ سال وفات اور عمر ۷۰ سال

تذکرہ دبستان شاعری لکھنؤ بھی اس کا ہمنوا ہے - اگر انتخاب یادگار کی بیان کی ہوئی عمر کا لحاظ کیا جائے جس کی رو سے ۱۲۹۰ھ میں ۶۶ سال کی عمر تھی تو ۱۲۹۹ھ میں ۷۵ سال کی عمر ہوتی ہے - لیکن رامپور کے اخبار "دبدبہ سکندری" مطبوعہ ۸ رمضان ۱۲۹۷ھ

چار بیت

اس میلے میں علاوہ عام چار بیتوں کے کچھ ایسی چار بیتیں بھی گائی جاتی تھیں جو مختلف استادوں نے خصوصیت سے اس میلے اور نواب خلد آشیاں کی ثنا و صفت میں لکھی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ رامپور کے پٹھان افغانستان سے چار بیتوں کا مذاق ساتھ لائے ہیں۔ اُن کی عادت ہے کہ جب کوئی نیا واقعہ پیش آتا ہے خواہ وہ غم کا ہو یا خوشی کا تو اپنے جذبات کا اظہار چار بیت کے ذریعے کرتے ہیں۔ چونکہ چار بیت ایک جذباتی نظم ہوتی ہے اور قدما جذبات کے مقابلے میں عروضی سقام کی پروا نہیں کرتے تھے اس لئے یہ عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ چار بیت کو عروض کی کڑی نگاہ سے نہ دیکھا جائے تاکہ اسے

مطابق ۱۶ اگست ۱۸۹۸ء سے ثابت ہوا کہ نیر شکوہ آبادی کا انتقال عام دبائے ہیضہ میں ۵ رمضان المبارک ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ کے دن رامپور میں ہوا۔ اس طرح دونوں تذکروں کے بیانات غلط ثابت ہوئے۔ صحیح سال وفات اور تاریخ کا تعین ہو گیا۔ اور عمر ۶۳ سال ثابت ہوئی۔

مدفن کے متعلق جان صاحب کے نواسے محمد حسین صاحب سے معلوم ہوا کہ نیر شکوہ آبادی باغ مہدی علی خاں کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ لیکن نیر صاحب کے پوتے سید محمد محسن صاحب سے معلوم ہوا کہ جناب نیر سرائے دروازے کے متصل کوچہ میاں خان کے پاس مقبرہ لاڈلی جان میں دفن ہوئے۔ میری رائے میں سید محمد محسن صاحب کا بیان بوجہ رشتہ قابل ترجیح ہے۔

"تاریخی اور جذباتی حدود تک محدود رکھا جاتا ہے۔ میلے کی خاص چاربیت،، جس کا پہلا مصرع ہے۔ "میلے کا شہرہ ہوا ملک ہندوستان میں" اب کسی کو یاد نہیں۔ انتہائی کوشش سے چھمن استاد عمر ۸۵ سال ساکن محلہ نالا پار نے ۱۲۵ برس پہلے کی گائی ہوئی ایک چاربیت کو قوت حافظہ سے صفحۂ کاغذ پر ثبت کرایا۔ اس لئے ایک ہی چاربیت پر اکتفا کرنا پڑا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چاربیت کا لطف کاغذ پر نہیں بلکہ دف پر گانے اور خوش الحان چاربیت گانے والوں کے پرجوش زیروبم میں آتا ہے۔ آج کل بعض مقامی شعرا نے چاربیت سے عروضی اسقام کو دور کر کے شاعرانہ رنگ دے دیا ہے۔ اور چاربیت کو ترقی یافتہ صورت دیدی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ تاریخ کا مذاق قدامت پسند واقع ہوا ہے۔

چاربیت جو میلے میں گائی جاتی تھی

تم کو خدا نے کیا کلب علی خاں نواب — عرض اس ناچار کی سنئے زہے انتخاب
کیسی یہ رونق ہوئی صحن گلستان میں — کوٹھیاں اور کمرے سجے باغ کے ترتیبان میں
صدہا جوان ہیں تری دید کے ارمان میں — دیکھ تو آنکھیں اٹھا اوٹ دے منھ سے نقاب

تم کو خدا نے کیا کلب علی خاں نواب"

تیرا ثانی کوئی اور نہ ایسا بشر — ملک میں کٹھیر[1] کے آیا نہ مجھکو نظر
تیرا بیاں کیا کروں سن تو اے رشکِ قمر — رو برو تیرے خجل ہوتا ہے ہر ماہتاب

تم کو خدا نے کیا کلبِ علی خاں نواب۔

جسم ہے سارا جہاں سب کا ہے جان ہے تو — حسن و لطافت میں بھی رشکِ گلستاں ہے تو
زور و شجاعت میں بھی رستمِ دوراں ہے تو — تیرے مقابل سپر ڈالے ہے افراسیاب

تم کو خدا نے کیا کلبِ علی خاں نواب

تجھ سا دلاور بھی دیکھا نہیں دور دور — چاند سا مکھڑا ترا جس پہ خدا کا ہے نور
کر دعا سید حسین ہو سدا شاد تو — دہر میں ہے جب تلک گردشِ آفتاب

تم کو خدا نے کیا کلبِ علی خاں نواب

پنکھے کا جلوس میلے کے آخر دن قدم شریف پر پنکھا چڑھانے کی رسم بڑی شان و شوکت سے ادا ہوتی تھی۔ جلوس کی ترتیب ملاحظہ ہو۔ سب سے آگے شتر سواروں کا دستہ با وردی زر بفت

---

[1] "کٹھیر" اس خطے کا پرانا نام ہے جو روہیلوں کی فتح مندیوں کے باعث روہیلکھنڈ کے نام سے موسوم تھا جو اب صوبہ یوپی کی ایک قسمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ روہیلکھنڈ کی حکومت کے بانی اول سردار داؤد خاں تھے۔ ان کے بعد نواب سید علی محمد خاں (جو سردار داؤد خاں کے متبنیٰ تھے) جانشین اور پہلے رئیس ہوئے۔ نواب خلد آشیاں اسی سلسلے کی بقیہ ریاست رامپور کے ساتویں حکمراں تھے۔

مسلح چلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد کرٹ کیپٹ اور ڈنکا۔ اس کے بعد باڈی گارڈ
کا رسالہ زرق برق وردی سے آراستہ۔ اس کے پیچھے فتح جنگ کا رسالہ ننگی
تلواروں سے مسلح۔ پھر صفائی کے ملازمان گزرگاہ کو لید وغیرہ سے صاف کرنے
کے لئے۔ اس کے پیچھے ہلی غول یعنی بے قاعدہ فوج کا رسالہ جو تلواروں اور
توڑے دار بندوقوں سے مسلح ہے۔ غرض ریاست کی کل فوج جس کی تعداد
ڈھائی ہزار ہے باستثنائے جوانان مامورہ بہ دیگر خدمات سرکاری کمربستہ ہے۔
گویا فوج کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو بڑی شان و شوکت سے رواں ہے
اس کے بعد پولیس کا دستہ ہے۔ پھر کہاروں کے کاندھوں پر ایک تخت نظر
آتا ہے جو بیش قیمت کپڑوں سے منڈھا ہوا ہے۔ اس پر نوبت نواز بیٹھے ہوئے
نوبت بجا رہے ہیں۔ اس کے پیچھے چوبدار، عصا بردار، علم بردار، ترکی بردار اور
ہرکاروں کا گروہ چاندی سونے کی عصائیں، نقرئی علم اور ترکیاں وغیرہ
ہاتھوں میں لئے زرق برق وردی پہنے کمر پر پٹکا اور سروں کی جگمگاتی پگڑیاں
باندھے رواں ہے۔ آگے آگے روشن چوکی بج رہی ہے جو شہنائیوں کے ترنم
تماشائیوں کو مست کئے دیتی ہے۔ سب سے آخر میں نہایت شاندار سجے ہوئے
ہاتھی پر چاندی سونے اور موتیوں سے جڑا دکھائی آتا ہے۔ جو اپنی زریں جھالر
اور جگمگاہٹ سے نگاہوں کو خیرہ کئے دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صلوٰۃ خوان
اور نعت گو با جماعت پُر زور آواز سے سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری کر

کئے دیتے ہیں۔ چنور بردار چنور ہلا رہے ہیں۔ "اگر سوز" بردار اگر کی بتیوں سے
میلے کو مہکائے دیتے ہیں۔ راستے میں تماشائی دو طرفہ پرا باندھے مؤدب
کھڑے ہیں۔ غرض پنکھا چڑھانے کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا ہوتی ہے
تمام اراکین و اعیانِ ریاست جلوس کے ساتھ پا پیادہ چل رہے ہیں۔ غرض
یہ ایسا منظر ہوتا تھا کہ اکثر اس کے فوٹو لئے جاتے تھے

یہ جلوس "بدر منیر" کی کوٹھی سے اٹھکر احاطے کی دیوار کے باہر باہر جاتا تھا
اور فوجی کیمپ کی طرف سے گزرتا ہوا قدم شریف کے اس راستے سے جاتا تھا
جو احاطہ باغ بے نظیر کے مشرقی دروازے سے قدم شریف تک گیا ہے ۔
نواب صاحب کا جلوس کے ساتھ جانا ثابت نہیں ہوا ۔

آخری دن کے حالات کی تفصیل تاج الاخبار مطبوعہ ۳۰ مارچ ۱۸۷۶ء میں
اس طرح تحریر ہوئی ہے ۔

کون سی عشرت کی شے ہے جو نہیں آئی یہاں
جشنِ جمشیدی بھی تھا ادنیٰ تماشائی یہاں"

للہ الحمد وہ وقت آیا کہ اتوار کے دن اس مبارک میلے نے اختتام
پایا۔ باغ کے سیکڑوں خیام فلک فرسا مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے تھے ۔
سب کے واسطے فرش ۔ گاؤ تکیے ۔ روشنی کا سامان مہیا تھا۔ کورے کوزے
گھڑے گھڑونچیوں پر دھرے تھے۔ بلا دُور دُور سے رؤسائے عالی وقار و امرائے نامدار

تشریف لائے۔ سب نے حضور پرنور کی مہمان نوازی کے لطف اٹھائے۔ سب کے واسطے وہ طعام لذیذ جنکو نعمائے نعیم کہنا چاہئے۔ مہیا تھے۔ ایک جانب بازیگروں کے تماشے طلسم کے کارخانے قطار قطار۔ اس طرف قوالان ملائک فریب کی ترنم سرائی۔ صرّاف۔ بزاز۔ بساطی۔ نان بائی۔ حلوائی۔ کبابی تنبولی۔ فالودے والے۔ برف والے۔ نہایت ترتیب و آرائش سے دوکانیں رات دن برابر کھلی ہوئی۔ غرض آٹھ دن تک یہی عشرت کا جلسہ رہا۔ بڑی دھوم دھام کا میلا رہا۔ آٹھویں روز ہفتے کو چار بجے (سہ پہر) ہوا خواہان اسلام کی بادِ مراد کا جھونکا نسیم خلد جلو میں لئے حور جنت کی طرح بادۂ کوثر سے مست جھومتا ہوا آیا۔ نقش قدم سلطان انبیاء خواجہ سردوسرا حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر پنکھا چڑھایا گیا جلو میں آدمی کیا فرشتہ بھی زمین ادب چومتا ہوا آیا۔

آگے آگے شتر سوار۔ اس کے بعد سواروں کا رسالہ قطار در قطار۔ ازاں بعد تلنگوں کی پلٹن۔ بعدہٗ گولہ اندازوں کا ہجوم۔ پھر بیرق والے۔ پھر نعت خوانوں کی دھوم۔ گویا دریائے مطہر موجزن۔ جلوس دیکھکر ہر تماشائی حیران تھا۔ قیامت کا سامان تھا۔ ہاتھی پر پنکھا تھا یا گردوں پہ آفتاب۔ بادلے کی کرن تھی یا شعاع مہر کا جواب۔ غرض خدام فلک احتشام دین اسلام اس دھوم سے درگاہ شریف میں پنکھا لائے۔ ہوا خواہان نے لانیوالوں کے قدم آنکھوں سے لگائے

اخبار دبدبۂ سکندری رامپور مورخہ ۱۱ رصفر ۱۲۹۱ھ مطابق ۳۰ رمارچ ۱۸۷۴ء
بھی اس آخری دن کے متعلق کچھ لکھتا ہے۔ اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے

"اس ہفتے میں میلہ باغ بے نظیر بخیر و خوبی پایۂ اختتام کو پہنچا۔ ہر چند کہ یہ جلسہ نادر روزگار اسباب بے نظیر و بے مثل ہوتا ہے کہ اگر مفصل کیفیت اسکی لکھی جائے تو ایک دفتر طویل ہو جائے لیکن بباعث نہ رہنے گنجائش کافی کے بطور خلاصہ لکھا جاتا ہے کہ ابتدا سے تا انتہا طرح طرح کے جلسے اور تماشے رہے۔ ہر ایک تماشا گر و صناع کو حسب قدر و مراتب سرکار سے انعام تقسیم ہوا۔ نزدیک و دور سے رؤسائے عظام مثل جناب فخرالاخوان سیٹھ محمد [illegible] صاحب جو نامی رؤسائے بمبئی سے ہیں اور جناب معلی القاب سرتاج راجہ شیوراج سنگھ بہادر رئیس مراد آباد و جناب محمد سلطان علی خاں صاحب بہادر و جناب [illegible] صاحب اڈیٹر و مہتمم اخبار و جناب منشی دیوان چند صاحب مالک اخبار "کوہ نور" و جناب لالہ رام چند صاحب و لالہ [illegible] ساہوکاران وغیرہ تشریف لائے۔ منجانب سرکار خاطر و مدارات بہت عمدہ طور سے عمل میں آئی۔ ملکوں ملکوں سے بڑے بڑے تجار ہر قسم کا مال و اسباب لائے۔ منافع کثیر سے مالا مال ہوئے۔ جناب غلام حیدر خاں صاحب کوتوال شہر کا نہایت عمدہ بندوبست رہا۔ کسی کا ایک حبّہ کا نقصان نہ ہوا۔ میلے کے روز بعد سہ پہر حسب معمول قدم مبارک حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر

بڑی شان و شوکت سے نیکھا چڑھایا گیا۔

پٹہ و بنوٹ

اتوار کے دن بعد عصر کے ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو اکھاڑا جمع ہوا اور خلائق کا بھی اس روز نہایت مجمع تھا۔ سرکار دولت مدار نے میر وزیر حسین صاحب پھکیت اور میر باقر علی صاحب ساکن بنارس کو حکم دیا کہ دونوں صاحب اپنے اپنے کرتب دکھائیں۔ حکم کی دیر تھی کہ دونوں صاحب سپر و گتکا لیکر میدان اکھاڑے میں مستعدی سے آئے ادھر حضور پرنور دام اقبالہم خندہ پیشانی کے ساتھ متوجہ اور مخاطب ہوئے تھوڑی دیر باہم دونوں صاحبان نے اپنے اپنے فن دکھائے۔ آخر طرفۃ العین میں جناب میر وزیر حسین صاحب پھکیت جو معرکہ پٹہ بازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ گتکا مارا۔ باوجود اس کے کہ میر باقر علی صاحب کے ساتھ سپر تھی۔ میر صاحب کے ہاتھ پر گتکا لگا اور خون کا رنگ ہاتھ پر نمایاں تھا۔ یہ ہونا تھا کہ چار سمت سے آواز "وہ مارا وہ مارا" بلند ہوا۔ سرکار یہ سنکر اور خود ملاحظہ فرما کر غایت درجہ مسرور و محظوظ ہوئے اور بوجہ قدر دانی ایک جوڑا طلائی کڑوں کا اور ایک دوشالہ مرحمت فرمایا۔ اسی روز شام کو بموجب قاعدۂ قدیم روشنی ہوئی۔ بعد ادائے نماز عشا سرکار بلند اقتدار بجرے میں سوار ہوئے جو ہر جہت نہایت پرتکلف شامیانہ کار چوبی وغیرہ سے آراستہ تھا۔ اس وقت کی کیفیت قابل دید تھی۔ بعدۂ قریب ۱۲ بجے کے آتش بازی چھوٹی۔ دوشنبہ کے

روز بعد اشنان کے دن سے حضور پر نور رونق بخش دار الریاست ہوتے ہنگام مراجعت فرمائی و رونق افروزی ۱۳۱۔۱۳۲ فیر توپ ہائے سلامی کی سر ہوئیں۔

میلے کی عام مقبولیت

اس میلہ کی ہمہ گیر غیر معمولی شہرت نے تمام ہندوستان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور ہندوستان کے اطراف سے امراء رؤسا اور مشاہیر کے علاوہ والیان ریاست بھی جوق در جوق بحیثیت مہمان آ کر شریک ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ صرف ایک سال کے میلے میں خاص خاص مہمانان کا حال آپ اخبار دبدبہ سکندری میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اگر ہر سال کے کل مہمانوں کی فہرست تیار کی جائے تو ایک ضخیم جلد ہو جائے گی۔

اخبار دبدبہ سکندری کے جو فائل دستیاب ہوئے اور جو پڑھے جا سکے ان سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ صاحب ہلکر والی اندور دوبارہ آئے۔ راجہ سر ڈگبجے سنگھ صاحب سی۔ایس۔آئی تعلقہ دار بلرامپور بھی ۲۷ مارچ ۱۸۷۳ء کو میلے کی شرکت کی غرض سے باضابطہ آئے اور ان کا قیام رنگ محل میں ہوا۔ اسی طرح اور مہاراجگان دتیا وغیرہ بھی شریک ہوئے ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ میلے کی متذکرہ بالا خصوصیات ایسی تھیں جن کے باعث

اس میلے کی تمام ہندوستان میں دھوم ہو گئی تھی

میلے کا اشتہار

اس سلسلے میں میلے کا ایک منظوم اشتہار بھی ملاحظہ فرمالیجئے جس کی نقل اخبار دبدبۂ سکندری مورخہ ۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء میں درج ہے۔

بہار آئی سارا جہاں سبز ہے — زمیں سبز ہے آسماں سبز ہے
جوانان گلشن ہوئے سبز بخت — روش پر کھڑے جھومتے ہیں درخت
چمن میں نہیں سبزہ آراستہ — زمرد کا ہے فرش پیراستہ
کہیں شاخ رقصاں سرِ دست ہے — کہیں نرگس مست بدمست ہے
گلوں نے دکھائی ہے تازہ بہار — کہ بلبل کے دل میں کھٹکتے ہیں خار
ہوا سرد چلتی ہے گلزار میں — صبا ہل اگلتی ہے گلزار میں
یہی وقت ہے گردشِ جام کا — موافق ہوا دور ایام کا
کہو دختر رز سے باہر نکل — رہے شیشے میں تو نہیں یہ محل
عجب روپ ہے کچھ عجب شان ہے — مگر پھر یہ میلے کا سامان ہے
جو ہیں اہل شوق ان کے کھلے نصیب — کہ میلے کا وقت آگیا ہے قریب
عروسانہ ہے زینت رامپور — ازل سے یہی جائے دارالسرور
یہی باغ دنیا میں ہے بے نظیر — جہاں میں نہ کیوں نام ہو بے نظیر

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے (اقبال)

شبِ جشن

میلے کی آخری رات ہے۔ شام ہی سے باغ کے چپے چپے تختے تختے اور روش روش پر روشنی ہو رہی ہے خصوصاً نہر کے چاروں طرف چوبی رنگین ٹٹیاں نصب ہیں۔ ٹٹیوں پر لال، ہرے اودے اور سفید رنگ کے ابرک اور کاغذ کے قمقمے اور کنول روشن ہیں۔ قمقموں کے عکس نے نہر کے شفاف پانی میں آگ سی لگا دی ہے۔

بجرے کے نشستین پر مخملی کارچوبی شامیانہ۔ شامیانہ کے نیچے کارچوبی مسند اور گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے۔ رنگا رنگ کے بلوری قطار در قطار قمقموں سے بجرا بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ حضور پرنور رات کے دس بجے کے قریب بجرے پر سوار ہوتے ہیں۔ کوٹھی بے نظیر سے نہر تک موسیقی کے باکمالوں کی دو رویہ قطار ہے ہندوستان بھر کی مشہور طوائفیں اور گویے صف بستہ کھڑے ہیں۔ اربابِ نشاط مبارکباد کے نغموں کی سریلی تانوں سے میلے بھر کو مسحور کئے دیتے ہیں۔

تماشائیوں کا ہجوم ٹھٹ لگائے کھڑا ہے۔ نواب صاحب بجرے پر قدم رکھتے ہیں۔ تو سب ملکر "ہمیشہ دلیر سجاں مبارک بادشاہ" کا مشہور گیت نہایت دلآویز ترنم سے سازوں کی ہم آہنگی کے ساتھ گاتے ہیں۔ جب نواب صاحب بجرے میں سوار ہو کر مسند نشین ہوتے ہیں تو خاص خاص مہمانان، شعراء

مصاحبین اور عمائدین حسب ایمائے ہمایوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ گنگا جمنی بجوان سے شغل شروع ہوتا ہے۔ بجرا حرکت کرتا ہے۔ "تو" موری نیا لگا دو پار" [1] آس پاس بیٹھے سارے براتی۔ بیچ میں دولہو نواب "موری نیا لگا دو پار" کا گیت گایا جاتا ہے۔ اس کے بعد عام رقص و مجرا شروع ہو جاتا ہے بجرا تیرنے لگتا ہے اور رات کے ۲ بجے تک اسی نغمہ و رقص کی حالت میں نہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک برابر تیرتا رہتا ہے۔ تماشائی ہندوستان کی منتخب ہستیوں کے رقص و نغمہ سے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ ۱۲ بجے کے بعد نہر کے شمالی سمت میں آتشبازی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ اور تفریحی مشغلے کا آخری ایک روشن اور نیا دور شروع ہوتا ہے۔ آتشبازی کے چکر اور قلعوں سے زمین اور فضا روشن ہے ہوائیاں اور انار فضا میں اپنی جداگانہ بہار دکھا رہے ہیں کہیں چھچھوندریاں اپنے چکروں سے ایک آفتابی دائرہ بنا رہی ہیں۔ غباروں کی کثرت سے زیر فلک تاروں کا ایک دوسرا آسمان نظر آتا ہے۔ گرتے ہوئے غباروں کو پکڑنے کے لئے تماشائیوں میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

اب آپ شب جشن کے چراغاں۔ رقص و سرود اور آتش بازی کے

---

[1] مبارک باد کے گیت اور "موری نیا پار لگا دو" کے گیت گانے کا حال حبیب الرحمن خاں ساکن محلہ چاہ شور سے معلوم ہوا۔

تفصیلی حالات اخبارات اور شعرائے کرام سے سنیں تو زیادہ لطف آئے گا۔

"تاج الاخبار" مورخہ ۳۰ مارچ ۶۵ء تحریر کرتا ہے کہ

رات کو باغ میں جشن خسروی کا سامان ہوا۔ تختے تختے پر وفور چراغاں سے چرخ کوکب کا گمان ہوا۔ اس باغ میں ایک پختہ نہر نہایت عمیق، عریض اور طویل ہے۔ نہر کیا ہے ایک طلسم کی جھیل ہے۔ اس کے گرداگرد رنگین کنول روشن ہوئے۔ وہ کنول مشعل مہتاب پر چشمک افگن ہوئے۔ ایک جانب کئی سو روپے کی آتشبازی نصب کی گئی۔ نہر میں دو ناویں باندھ کر ان پر مکلف فرش کیا گیا۔ بجرا بنا ہوا۔ اس پری بجرے پر ناخدائے طوفان رسیدگان نشہ بادہ حوادث جس نے ہزاروں کو موجہ عسرت سے کنارہ عشرت پر لگا دیا، سوار ہوا۔ مبارکباد کی دھوم ہوئی۔ ۱۲ بجے تک حضور پرنور ناچ دیکھتے رہے۔ بجرا نہر میں تیرتا رہا۔ ۱۲ بجے آتش بازی چھوٹی۔ تماشائیوں نے گلہائے رنگارنگ کی بہار لوٹی۔ حضور پرنور بجرے سے کوٹھی میں تشریف لائے۔ آرام فرمایا۔ دن کو ۴ بجے حضور پرنور نے دولت سرا کو معاودت فرمائی۔ میلے نے اختتام پایا۔

اس سلسلے میں منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے جذبات ملاحظہ ہوں۔

چراغاں

یہ ہنگامۂ عشرت متصل — رہا سات دن تا طرب بخش دل

بنے دیدۂ انجم سے چرخ بریں
سراپا بنا دیدۂ دوربیں

چراغاں سے پھولی زمیں پر شفق
شب ماہ کا ہو گیا رنگ فق

جو برق ضیا چمکی افلاک پر
گری چاندنی کھا کے غش خاک پر

لب نہر اک عالم نور تھا
نہ آب تھی جلوۂ طور تھا

یہ دعویٰ تھا ہر ایک گرداب کو
کہ نسبت نہیں مجھ سے مہتاب کو

چراغوں کے پرتو سے بالائے آب
بنی کہکشاں موج و انجم حباب

ادھر تو یہ عالم تھا مد نظر
خدیو جہاں نے بیکایک ادھر

دیا حکم توڑ عسلے نور کا
کہ ہو جائے عالم سوا نور کا

آتشبازی و خاتمہ

فتیلوں میں دی آگ خدّام نے
غبارے ہوا میں چلے سامنے

ہزاروں جو یک بار چھوٹے انار
ہوا صحن گلشن میں رقص شرار

اڑا اک طرف قلعہ میدان میں
فرشتوں نے دیں انگلیاں کان میں

صدا توپ کی بم کے گولو نے دی
زمیں آسماں کے برابر ہلی

کلس قصر شاہی کے مہتاب سے
چمکنے لگے تاب مہتاب سے

چلیں زور میں اس قدر چرخیاں
کہ چکر میں آیا سر آسماں

غرض خاک سے چرخ تک رات بھر
سوا شعلے کے کچھ نہ آیا نظر

تماشائیوں کی تمنائے دل　　نکلتی رہی رات بھر متصل۔

عیاں جب ہوا حسنِ دلجوئے صبح　　چھپی شب میں جلوۂ روئے صبح
کیا خوابِ چشم انجم کو بند　　کھلے سر اٹھا مہر فیروز مند
ہوا ختم میلا تو خاص و عوام　　گھروں کو چلے خرم و شاد کام
جو اسباب بکنے سے باقی رہا　　وہ سب لے لیا دیکھ کا ہل بہا
ہر اک کو علیٰ قدر اعزاز و جاہ　　عنایت کیا آپ نے زادِ راہ
وہاں سے مع ساز و سامان و مہر　　ہوئے رونق افروز ایوانِ شہر
اسی دن سے ہر سال میلا یہاں　　مقرر ہے بہر رفاہ جہاں ہے
ہزاروں ہیں اس فیض سے کامیاب　　خلائق کا ہے فائدہ بے حساب۔

افسوس کہ مرزا معین الدین حیدر غمگین لکھنوی کا قصیدہ بسلسلۂ جشن بے نظیر دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے انتخاب یادگار کے مندرجہ دو شعروں پر ہی اکتفا کرنا پڑا ۔

تعریف باغ

دُلہا آئی ہے عالم میں کہ ہو عشرت باب　　رونقِ باغ نبی حسن لاجواب

آتشبازی

چکرا ایسے کہ فلک دیکھ کے چکر میں ہے صورت آئینہ دریا میں ہے ساکن گرداب

اب حضرت جلال لکھنوی کی باری آتی ہے۔ ان نادر اور دلآویز تشبیہات کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں اور لطف اندوز ہوں۔

بجرا

جو نہر آسماں ہے تو بجرا قمر فلک پر ہے گردش میں گویا قمر
اگر نہر کو کہیے دریائے نور تو بجرے کو کشتیِ صہبائے نور
صفائی میں ہے نہر آئینہ سال لطافت میں بجرا ہے روحِ رواں
نزاکت کا بجرے کے پوچھو نہ حال کہ پانی میں چلتا ہے موجوں کی چال
وہ بجرا کہ نواب جس پر سوار وہ بجرا کہ پریوں سے جو ہمکنار
وہ بجرا دکھاتا ہے جو شانِ حسن وہ بجرا جو تختِ سلیمانِ حسن ”
وہ بجرا جہاں طرفہ تیاریاں وہ بجرا کہ جس پر ہیں گلکاریاں
وہ بجرا جہاں جملہ سامانِ عیش وہ بجرا جو اک سقفِ ایوانِ عیش
وہ بجرا جو ہم پلۂ مہوشاں وہ بجرا جو ہم رتبۂ کہکشاں ”
وہ بجرا شبِ ماہ جس پر نثار وہ بجرا ہوا خواہ جس پر نثار

وہ بجرا جو سرتاج نہرِ جناں — وہ بجرا جسے کہئے تختِ رواں۔
وہ بجرا خراماں جو مثلِ نسیم — وہ بجرا جو چلنے میں موجِ شمیم
وہ بجرا جہاں نا خدا موجِ باد — وہ بجرا فدا جس پہ بادِ مراد
وہ بجرا جو اک تختۂ بوستاں — وہ بجرا جو گلدستۂ دوستاں

چراغاں

چراغاں کا عالم بھی ہے دیدنی — چمن دشت ایمن ہے پُر روشنی
وہ خوش قطع تھا ہر دو طرفہ گڑے — کہ چشمِ تماشا انھیں پر پڑے
جو ہر سو چراغاں ہے وہ نخلِ طور — جدھر دیکھیے اس طرف جوشِ نور
ستاروں سے تابندہ زرِ چراغ — فروزندہ ہیں گوہر شب چراغ
تجلی سے عالم دکھاتا ہے باغ — فروزاں ہے لالے کے بھی آج داغ
یہی باغ میں چار جانب ہے غل — "چراغ تر ہو گیا آج گل"
چراغاں سے ہے مہر روشن کنول — دکھاتے ہیں میلے کو جوبن کنول۔
ہوا سے جو سب جھلملا جاتے ہیں — ادا ہائے رنگیں دکھا جاتے ہیں۔
ہوئے ہیں جو پرتو فگن آب میں — کھلاتے ہیں طرفہ چمن آب میں
فروزاں چراغِ لبِ جو ادھر — بہار آتش افروزیوں کی ادھر

آتشبازی

شگفتہ ہیں وہ لالہ زار ایک جا ۔ گل افشاں ہیں لو را و رنار ایک جا
دل افروز ہیں کیا شراروں کے پھول ۔ دکھاتے ہیں عالم انار دکے پھول
شجر آتشیں ہیں وہ آتش بہار ۔ جل اٹھتے ہیں تو حسد سے خیار
وہ مہتاب جس سے رخ ماہ فق ۔ ہوائی جو چھوٹی تو پھولی شفق
بدلتی ہیں یوں چرخیاں رنگ چرخ ۔ بشر بھول جاتے ہیں نیرنگ چرخ
نہیں قلعۂ آتشیں کا جواب ۔ جو گولا چلا بن گیا آفتاب
غبارے جو اٹھ کر ہوئے ہیں بلند ۔ شب جشن کو دی ہے رونق دو چند
فلک سے کئی چاند اترتے ہوئے ۔ چلے آتے ہیں سیر کرتے ہوئے

رقص و سرود

جدھر دیکھیے بزم آرائیاں ۔ ہر اک جا ہجوم تماشائیاں
کہیں کوئی رقاصۂ خوش جمال ۔ دلوں کو کیے دیتی ہے پائمال
اک آفت بپا کرتی ہے رقص میں ۔ قیامت بپا کرتی ہے رقص میں
کسی بزم میں کوئی زہرہ ادا ۔ اس آواز سے ہے ترنم سرا
کہ ہیں اہلِ محفل ادھر وجد میں ۔ فلک پر ہے زہرہ ادھر وجد میں

سنا تھا نہ سازوں کا ایسا ملاپ
نہایت خوش آئندہ طبلے کی تھاپ

صدا جاتی ہے دور تک بین کی
فلک سن رہا ہے گمک بین کی

مجیروں نے باندھا ہے ایسا سماں
کہ سکتے میں ہے کوئی آسماں ہے

یہ عالم کہ در مست دیوار مست
چمن انجمن دشت کہسار مست

کہیں خوش نگاہان محفل فریب
کوئی ان میں گلکش کوئی دلفریب

کہیں جمع کچھ مطرب خوش گلو
کہیں جمع کچھ ساقی ماہرو

تماشائیوں کی حالت

کہیں شعر خوانوں کا ہنگامہ گرم
کہیں خوش بیانوں کا ہنگامہ گرم

کہیں عارفان صفا کیش جمع ہے
مشائخ کا ہنگامہ درویش جمع ہے

کہیں صوفی اک حالت جذب میں
ز خود رفتہ کیفیت وجد میں ہے

کہیں مجتمع زاہد پاک ذات
کہیں جمع رنداں تہدی نغات

کہیں شیخ سرگرم گفت و شنید
کہیں جمع پیر مغاں کے مرید

تماشائیوں کی کہیں انجمن ہے
خراباتیوں کی کہیں انجمن ہے

ترنم سراسر خوش ہے کہیں
تو تسبیحوں میں خوش وقتے کہیں ہے

کہیں چند معشوق سرگرم ناز
کہیں چند عشاق محو نیاز

کہیں چند خوبان لیلیٰ جمال
کہیں چند مجنون آشفتہ حال ہے

کہیں چند محبوب شیریں ادا | کہیں چند فرہاد صاحب وفا
جسے دیکھئے رنگ میں اپنے مست | جسے دیکھئے وہ تماشا پرست
غرض ایک ہنگامہ خاص و عام | خلائق کا چاروں طرف اژدہام
یہ پہنچا ہے لوگوں کی کثرت کا حال | نگہ کو بھی ہے آمد و شد محال
نکل جائے آ کر کوئی دخل کیا | چلا جائے جا کر کوئی دخل کیا

جلاؔل اب دعا پر ہو ختم سخن | کہ جب تک ہے انجم کی یہ انجمن
یہ کلب علی خاں والا مقام | با قبال و دولت رہے شادکام
یہ جمشید ثانی سلامت رہے | یہ میلے کا بانی سلامت رہے

شب جشن میں موسیقی کے بیرونی ارباب کمال کے علاوہ جو دربار ی ماہران فن موسیقی حصہ لیتے تھے ان کے ناموں اور ہنر کی تفصیل جناب تیر شکوہ آبادی سے سنئے۔ جن پر نا قدانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

درباری اہل موسیقی

چست چالاک شوخ امانی جان[۱] | گفتگو میں بلا کی طراری ہے

۱؎ حشمت جان عرف انعم ۶ سال ملازم رہی۔ ارباب نشاط سے معلوم ہوا کہ امانی جان کا وطن کانپور تھا۔ سرکاری ملازم تھی۔ خیال اور ٹھمری اچھا گاتی تھی۔ نواب خلد آشیاں کے ہمراہ بمبئی کو بھی گئی تھی۔ خلد آشیاں کے انتقال کے بعد علی گڑھ چلی گئی میں ۱۹۱۲ء ۱۳۳۱ھ میں انتقال ہوا

۳۳۳۳۳

دلّی والی امیر جان[۵] نے بھی
پائی گانے میں سب کی سرداری
طبلے سارنگیاں ہیں ہم آواز
گونجتا ہے سپہر زنگاری

(بقیہ صفحہ ۷۷) اور وہیں دفن ہوئی۔ سید احمد علی صاحب مصاحب سرکار سے معلوم ہوا کہ لالی جان سیاہ فام تھی۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت نے پوچھا کہ لالی جان! جب روز ازل مخلوق کو حسن تقسیم ہو رہا تھا تو اس وقت کہاں تھی۔ فوراً عرض کیا۔ کہ قسمت کے بازار میں" سرکار کو یہ برمحل جواب پسند آیا۔

۵۔ بسلسلۂ تحقیق عبدالرزاق عمر ۸۲ سال ولد عبدالکریم رشتہ دار امیر جان سے گفتگو سے معلوم ہوا کہ۔ امیر جان طوائف پانی پت کی رہنے والی تھی۔ اس کا آبائی پیشہ ناچ گانا نہ تھا اس کے رشتے کا ایک بھائی اس کو پانی پت سے دلی لے آیا تھا۔ دلی ہی میں اس کو گانے کا شوق ہوا۔ اور ایک طوائف کی شاگرد ہوئی۔ اور گانے میں کمال پیدا کیا۔ وہ بات کرنے میں قدرے ہکلاتی تھی اور رنگ کالی بھی تھی لیکن گانا بالکل صاف تھا۔ ہکلاہٹ اور کالاپن کے باوجود اس کے گانے کے کمالات ایسے تھے اور بھی ہر دلعزیز کر دیا تھا۔ اعلیٰ حضرت کے عہد میں رامپور جایا کرتی تھی۔ اس کا انتقال دلی میں ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان ہوا۔

اسی سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ پانی پت کی رہنے والی ایک امیر جان اور بھی تھی جو دلی میں آکر آباد ہو گئی تھی۔ اس امیر جان کا انتقال ۸۰ برس کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں دلی میں ہوا ہے۔ اس کی ایک بیٹی نذیر النساء نامی زندہ ہے جن کی عمر ۴۰ سال ہے۔ اور بیٹے کا نام ظہیر ہے جس کی عمر ۶۰ سال ہے۔ بیٹی کا نکاح رامپور کے ایک صاحب زادہ صاحب سے ہوا تھا جن کے انتقال کے بعد وہ دلی واپس آگئیں اور کوچہ چیلان میں رہتی ہیں اور کثیر جائداد کی مالک ہونے کی وجہ سے نہایت فارغ البالی کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ لیکن یہ امیر جان رامپور نہیں جاتی تھی۔ بلکہ پٹیالہ، سنگرور اور رادھن پور جایا کرتی تھی۔

دھرتیوں میں امیر خاں[۲] بجتا — بین کاری میں بھی فسوں کاری ہے

۲؎ فدا علی خاں صاحب پسر خورد امیر خاں بین کار سے معلوم ہوا کہ ۔

امیر خاں نام تھا۔ باپ کا نام امرؔ خاں۔ مورث اعلیٰ مصری سنگھ جو مشرف باسلام ہونے کے بعد نبات خاں کے نام سے موسوم ہوئے۔ یہ نام ابوالفضل نے دربار اکبری میں تجویز کیا۔ قوم راجپوت راجہ کشن گڑھ کے بیٹے تھے۔ امیر خاں ضلع باندے میں پیدا ہوئے غدر کے بعد عہد نواب فردوس مکاں خلد آشیاں رامپور آئے۔ اور اپنے وقت کے کلاونت یعنی گانے کے اعلیٰ ماہر تھے۔ اور ہر قسم کا ساز بجانے کے لحاظ سے مشہور و معروف تنت کار بھی تھے۔ سرکاری مصاحبین میں نام تھا۔ ۱۲۸۹ھ میں نواب خلد آشیاں کے ساتھ حج کو بھی گئے تھے۔ رامپور میں ان کا مکان کٹرہ جلال الدین خاں میں تھا جو اب ایک ٹیلہ کی صورت میں ہے۔ انتقال ۵ رمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۳ر اگست ۱۸۸۰ء کو دفعتاً ہیضے میں رامپور میں ہوا۔ (ملاحظہ ہو اخبار دبدبۂ سکندری رامپور مطبوعہ ۱۶ر اگست ۱۸۸۰ء) شاہ رفیق صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

داستان حمزہ اور طلسم ہوشربا کے داستان انکی تصنیف سے ہیں جو سرکاری کتب خانہ میں موجود ہیں۔

ان کے بڑے بیٹے استاد وزیر خاں صاحب تھے جو نواب جنت مکاں کے استاد تھے۔ یہ بھی اپنے وقت کے مشہور و معروف کلاونت اور تنت کار تھے۔ شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد تھے ہندی میں گہر پیا تخلص کرتے تھے اور اردو میں "وزیر" ان کا انتقال ۱۹۲۶ء میں رامپور میں ہوا اپنے جناب عالیہ کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ دوسرے بیٹے فدا علی خاں صاحب ریٹائرڈ تحصیلدار تھے جن کا انتقال ۷۵ سال کی عمر میں ۱۸ دسمبر ۱۹۴۲ء میں رامپور میں ہوا۔ مدفن مقابر مومنین میں ہے۔ مکان کوچہ قاضی میں ہے

سے بہادر حسین خاں کے سبب — بار بد پر بھی ہے بے خودی طاری
ختم ان پر ہے سر سنگار رباب — ہاتھ کے قبضے میں ہے تیاری
سحر باقر علی کے گانے کا — رشک الحان بلبل و ساری
بل بے نازک خیالوں کا حسن — اف رے جادو نوائیاں پیاری

؎ (حسب بیان فدا علی خاں پسر امیر خاں -) بہادر حسین خاں ابن پیارے خاں تانسین کی اولاد سے تھے۔ امیر خاں بین کار کے ہمیا خسر تھے۔ عہد نواب فردوس مکاں میں امپور آئے ۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء کو تین سو روپے ماہانہ کے ملازم ہوئے۔ (ملاحظہ ہو اخبار الصنادید) اور سرکاری مصاحب ہوئے۔ وہ اپنے وقت کے نت کار اور نائک تھے۔ فن موسیقی میں کمال تھے۔ عشرۂ محرم میں ان کے یہاں بڑی دھوم دھام سے مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان کا انتقال ماہ صفر ۱۲۹۶ھ مطابق جنوری ۱۸۷۹ء میں رامپور میں ہوا۔ اور شہر سے شمالی جانب ڈگر یو دروازے سے آدھے میل کے فاصلے پر اپنے ذاتی باغ میں جو نواب خلد آشیاں نے انھیں عطا فرمایا تھا۔ دفن ہوئے۔

(تاریخ انتقال کے بارے میں ملاحظہ ہو اخبار دبدبۂ سکندری ۱۲ جنوری ۱۸۷۹ء)

ان کے لاولد انتقال کر جانے کی وجہ سے نواب جنت مکاں نے اپنے عہد میں بہادر حسین خاں کی بھانجی کے بیٹے محمد وزیر خاں کو یہ باغ عنایت فرمایا تھا ~~چنانچہ وزیر خاں اسی باغ میں دفن ہوئے~~۔

؎ - (حسب بیان حبیب الرحمٰن خاں ساکن محلہ چاہ شور) باقر علی خاں گویا دلی کا باشندہ تھا خیال اچھا گاتا تھا۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۹ء کو بعہد نواب خلد آشیاں ملازم سرکار ہوا۔ ایک سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ہوئی۔ اور قوال بچہ کے نام سے مشہور تھا۔ ستر سال کی عمر میں ۱۹۰۶ء میں رامپور میں انتقال کیا اور تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں دفن ہوا۔

جادؔی [٦] جھومنؔ [٧] کی وہ پری تانیں   قطع ممیؔ [٨] کے ٹپوں کی پیاری
ہے پکھاوج میں دھوم موڑھوؔ [٩] کی   ہند سے تا بہ آمل وساری
طاق سارنگیوں میں حیدر بخش [١٠]۔   واہ وا کرتی ہے سبھا ساری
بھانڈوں کی نقلوں پر چمن کے پھول   ہنستے ہیں مثل کبک کہساری

---

٦ (حسب بیان حشمت جان طوائف) جادی طوائف کا وطن لکھنؤ تھا۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں رامپور آئی۔ بہت اچھا گاتی تھی اور نہایت خوش گلو تھی۔ ستر سال کی عمر میں نواب خلد آشیاں کے انتقال سے چار سال پہلے یعنی ۱۹۲۶ء میں رامپور میں انتقال ہوا اور یہیں دفن ہوئی۔

٧۔ (حسب بیان حشمت جان) جھومن طوائف کا وطن پٹنہ تھا۔ بریلی ملا ظریف میں رہتی تھی۔ انتقال ۷۰ سال کی عمر میں رامپور میں ہوا اور قبرستان محلہ علی عصمت خاں یا قبرستان محلہ نالا پار میں دفن ہوئی۔

٨ (حسب بیان حشمت جان) ممی طوائف ٹپا گانے میں مشہور تھی۔ بعہد نواب خلد آشیاں ملازم سرکار رہی تھی۔ حشمت جان طوائف کی چھوٹی بہن تھی۔ ممی رامپور میں پیدا ہوئی۔ اور انتقال دلی میں ہوا۔

٩ (حسب بیان حبیب الرحمن خاں) موڑھو طبلچی کا وطن فرخ آباد تھا۔ اور پکھاوج اور طبلے کا استاد تھا۔ بعہد نواب خلد آشیاں ملازم سرکار تھا۔ ۷۵ سال کی عمر میں رامپور میں انتقال ہوا اور تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں دفن ہوا۔

١٠ (حسب بیان حبیب الرحمن خاں) حیدر بخش سپنت صوبہ پنجاب کا باشندہ تھا۔ سارنگی بجانے میں استاد تھا۔ بعہد نواب خلد آشیاں ملازم سرکار تھا۔ اسّی سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں فوت ہوا۔ اور تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں دفن ہوا۔ میر نیاز حسین اس کے شاگرد تھے۔ سارنگی کا بہت مشہور استاد تھا جس کا انتقال بعہد نواب جنت مکاں ۱۹۲۶ء میں رامپور میں ہوا اور مذکورہ بالا قبرستان میں دفن ہوا۔

ہندی شاعر بلدیو

اب میلے کے متعلق راج کبیشر (درباری شاعر) چوبے بلدیو داس لوہاری
بلدیو تخلص کے ہندی اشعار بھی ملاحظہ فرمالیجیے جو ان کے جذبات کا مرقع ہیں۔

سلہ چوبے بلدیو داس لوہاری۔ راج کبیشر یعنی شاہی دربار [illegible] ہوا مع چوبے جھگن ناتھ شاعر
لوہاری تخلص بلدیو۔ قصبہ شاد آباد تحصیل [illegible] کے رہنے والے تھے۔ نواب سید کلب علی خاں
ناظم فردوس مکاں کے عہد میں مصاحبین میں داخل تھے۔ جناب بلدیو کا اجمالی ذکر آب حیات [illegible]
میں ہے۔ ذیل کے تفصیلی حالات جدید تحقیق کے سلسلے میں راوی موہن صاحب ولد جگموہن لال
صاحب ابن چوبے بلدیو داس صاحب سے معلوم ہوئے۔

ایک مرتبہ نواب فردوس مکاں نے فرمایا کہ چوبے جی ہم کو ایک کہاوت یاد نہیں معلوم
ہوئی۔ چوبے جی نے عرض کیا کہ حضور ماشاء اللہ حضور کے مقابلے میں [illegible] کچھ بکنے ہی نہیں سکا
بات گزری ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ آم کے [illegible] کہ چوبے جی کتنے آم کھا سکتے ہو
خود بھی ایک طشت میں ایک سو پچیس آم اور [illegible] دودھ اپنے سامنے رکھ کر نوش فرما لیے۔
اور [illegible] آم اور دودھ [illegible] جب دونوں آم اور دودھ ختم کر چکے تو
نواب صاحب نے فرمایا کہ چوبے جی کیسے آم اور [illegible] عرض کیا کہ حضور پیٹ کا تو
[illegible]
[illegible] آپ نے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ [illegible]
چنانچہ [illegible]
[illegible]

سلہ تذکرہ [illegible]

تعریف جشن باغ بے نظیر در بحر ترنگی

سبھ دن ہر دینو سجس سلینو۔ میلا کینو سکھ دائی
اچھا دن خدا نے دیا۔ اچھی نیکنامی حاصل کی۔ میلا کیا۔ آرام دینے والا

دلہن بن آئے گنی سہائے۔ آنت جس گا۔ چھت چھائی
شہزادے آئے۔ ہنرمند اچھے اچھے۔ بہت تعریف کے لائق جس سے خوشبو پھیلی

آئے بہ راجا سنگ دل ساجا۔ سبن سجا جاکر۔ سوہیں۔
بہت سے راجہ آئے۔ ساتھ لئے مجمع آراستہ۔ اور سب نے سج بنائی۔ اچھی معلوم ہوتی ہے

سوداگر پورے۔ گنی سُسوری۔ دیکھت ڈوری۔ من موہیں
کمال دولتمند۔ ہنرمند بہادر۔ دیکھنے میں خوبصورت۔ دل کو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں

جوہری بسالم۔ پنا لالم۔ موتی مالم۔ کرسینی
جوہری بڑے بڑے۔ پنا اور لعل۔ موتیوں کے مالے۔ ہاتھوں میں لئے

کسمیری آئے۔ سال سلائے۔ بنی سہائے۔ رنگ بھینی
کشمیری آئے۔ شال اچھے لئے ہوئے۔ بنی ہوئی عمدہ خوش رنگ

(بقیہ صفحہ ۸۲) خاندان سے نکل گیا تھا۔ دوبارہ نسلاً بعد نسل آم کھانے کے لئے چوبے جی کو علاقہ فرمایا۔

چوبے جی نے حسب فرمائش نواب خلد آشیاں کریما اور مقیمان کا ترجمہ بھاشا زبان میں چوپائی کی صورت میں بہت خوب کیا تھا۔ چوبے جی کو فارسی اور عربی میں کافی مہارت تھی۔ وہ عہد خلد آشیاں میں بھی بدستور راج کبیشر رہے۔ اور خلد آشیاں بھی بہت عزت کرتے تھے۔

برتن کے ڈھیرم منو سمیرم۔ بنک کبیرم۔ سم سوہیں
برتنوں کے ڈھیر گویا سمیر (سونے کے پہاڑ) ہیں۔ سم میں کبیر کی مانند اچھے معلوم ہوتے ہیں

سندر حلوائی۔ لئے مٹھائی۔ رات سکھ داسے۔ من موہیں
خوبصورت حلوائی لئے مٹھائی۔ نہایت راحت دینے والی۔ دل کو بھاتی ہیں

دلی اکاشی۔ پٹنا باسی۔ جنس سکھاسی۔ لے دہائے
دلی اور کاشی اور پٹنے کے رہنے والے۔ مال بہت اچھا لے کر دوڑے

گن تی بساطی۔ اگنت بھانتی۔ بست بکائی۔ سب لائے
بساطی بکثرت۔ بے شمار اطراف سے چیزیں بکتی ہوئی۔ وہ سب لے کر

ناٹک ڈنٹ گاویں۔ بین بجاویں۔ نی دھن پاویں۔ نین بہائے
نٹ ڈٹے ہوئے گا رہے ہیں۔ بین بجا رہے ہیں۔ وہ مال پاتے ہیں۔ دلجوئی

کہوں مل اکھارے۔ ٹھہریں سبھاکے۔ گج متواری بیر آئے
کہیں پہلوان اکھاڑے میں۔ اٹھتے ہیں ہوا رہتا ہے جنگی لڑائی سے ہاتھی اتر آئے ہیں

(بقیہ حاشیہ ۳۸ پر) آخر وقت میں بستر مرگ پر ایک قصیدہ شاہ آباد سے لکھکر حضور میں پیش کرایا تھا

جس میں اپنی اور اپنے خاندان کی بے بضاعتی کا ذکر تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

جو کچھ خطا ہوئی بندے سے معاف کریں سرکار :: فدوی کے بچوں کے اوپر نظر عنایت ہے درکار

اس قصیدے کے پیش ہونے پر نواب خلد آشیاں نے چوبے جی کے لڑکوں کو طلب فرمایا اور بڑے بیٹے بنسی دھر کو چوبے جی کی جگہ عطا فرمائی۔ اور چھوٹے بیٹے چوبے رگھناتھ پرشاد کو جو دہلی میں لاٹ صاحب کے دفتر میں ملازم تھے طلب فرما کر افسر اطراف محلات کے عہدے پر ممتاز فرمایا اور پھر مصاحبین کے زمرے میں داخل فرمایا۔ چوبے رگھناتھ پرشاد زبان داں اور فن شاعری سے خوب آگاہ تھے۔ ان کی حاضر جوابی سے خوش ہو کر نواب سید حامد علی خاں جنت مکاں نبیرہ نواب خلد آشیاں نے انکو "بیربل ثانی" کا خطاب عطا فرمایا

چوبے بلدیو داس صاحب کا انتقال اسی برس کی عمر میں شاہ آباد میں نواب خلد آشیاں کے انتقال سے دو سال پہلے یعنی ۱۸۸۵ء میں ہوا

کہوں سوانگ بنائیں۔ تخت چڑھائیں۔ ڈھول بجائیں بنا گاویں
کہیں سوانگ بنائے ہیں تخت پر چڑھائے ہیں۔ ڈھول بجا رہیں۔ سب ملکر گا رہے ہیں

کہوں پٹی باجی۔ بیرن ساجی۔ کودت باجی۔ موں آویں۔
کہیں پٹے بازی ہو رہی ہے۔ سجے ہوئے سپاہی کودتے ہوئے گھوڑوں کی طرح آتے ہیں

بہ درب لٹایو۔ سب جگت آیو۔ سبھن پایو۔ بن سیوم ۔۔
بہت دولت لٹائی۔ سارا عالم آیا۔ سب نے پایا۔ بغیر محنت کے۔

آسکھا سناوے۔ آیے بڑھاوے۔ شیجس سگاوے۔ بلدیوم
دعا سناتا ہے۔ عمر بڑھائے۔ نیک نامی گاتا ہے۔ بلدیو کبیشیر

نگر نگر کے گنی سجے تان کلا ونت آئے بیں مان دان سبھی کو دینو ہے
شہر شہر کے لائق اور ہنر مند جتنے گیتیے اور گانے والے تھے آئے بکمال عزت انعام سبکو دیا ہے

دیس او بدیس کے جوہری دکاندار آئے۔ بیو پاری مال سبھی کو لینو ہے
اس شہر اور دوسرے شہروں کے جوہری دوکاندار آئے۔ سب کا مال مول لیا ہے

کب بلدیو سنو بہار وسن ہے ونی کی نیکی سبھا دیکھ یان۔ اندر سو کو چھینو ہے
کبیشر بلدیو کہتا ہے۔ روشنی کی خوبصورتی ظاہر ہے۔ اچھی محفل دیکھ کر راجہ اندر کا غرور چھینا ہے

سری جنت نواب کلب علی خاں بہادر نے میلا بے نظیر باغ بیچ لکھو ہے
حضرت نواب کلب علی خاں بہادر نے بے نظیر باغ میں میلا بے نظیر کیا ہے۔

حضرت داغ میلے میں

آپ کو اتنے مشہور شاعروں کا کلام ملاحظہ کرنے کے بعد تعجب ہوگا کہ حضرت داغ دہلوی کا کوئی کلام میلے کے متعلق پیش نہیں کیا گیا۔ اس حیرت کے دور کرنے کیلیے

صرف ان کی مثنوی "فریادِ داغ" مطبوعہ سنہ ۱۳۱۱ھ کا حوالہ کافی ہے۔
چونکہ حضرت داغ میلے کی سیر کرتے کرتے کوئے جاناں میں کھوئے گئے ہیں۔ اس لئے مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار پر اکتفا کرنا پڑا

آگیا بے نظیر کا میلا   دل پابندِ وضع کھل کھیلا
آفتِ جانِ ناتواں دیکھی   یک بیک مرگِ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا   سامنا ہو گیا قیامت کا
دیکھ کر اس پری شمائل کو   رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا   آنکھ ملتے ہی پھر پتہ نہ ملا
آبرو کا لحاظ و پاس کسے   ہوش میں آؤں یہ حواس کسے

عشق نے تازہ روپ بدلا تھا   میں بھی میلے میں اک تماشا تھا
میلے والوں میں دھوم تھی میری   خوش جمالوں میں دھوم تھی میری
ہوش آیا تو میں نے کیا دیکھا   اک پری چہرہ خوش ادا دیکھا
رخ سے ظاہر تھا نور کا عالم   اور اس پر غرور کا عالم

اس کے بعد حضرت داغ اپنی محبوبہ کو گلانہ خط بھیجتے ہیں۔ اور میلے میں شرکت کا شوق دلاتے ہیں۔

ان کو لکھا بطورِ استدراج   سارے میلوں سے ہے یہ بڑھ کر آج

دیکھو تم بے نظیر کے جلسے — ہر برس ہو سشہر کا بہا اولتے
تم نے بھی رنگ اسکے دیکھے ہیں — تم نے بھی ڈھنگ اسکے دیکھے ہیں
کچھ رہو رامپور میں آ کر — لطف اٹھاؤ حضور میں آ کر
پر یہ ہے شرط آ کے میلے میں — پھنس نہ جانا کسی جھمیلے میں

کلکتہ سے خط کا جواب آتا ہے۔

آئی مجھ کو جواب میں تحریر — اپنے آنے کے باب میں تحریر
ایسے میلے میں کیوں نہ آئیں ہم — کہ جہاں تم سا شخص پائیں ہم
کوئی جلسہ دکھانے والا ہو — کوئی ہم کو بلانے والا ہو
کیا نہیں ہم کو شوق خوب کہی — کیا نہیں ہم کو ذوق خوب کہی
باغ کی ہم بہار لوٹیں گے — داغ کی ہم بہار لوٹیں گے۔

مختصر یہ کہ محبوبہ میلے میں شرکت کرتی ہے اور دو ماہ کے بعد رخصت ہو جاتی ہے ان محبوبہ کا نام مثنوی سے حجاب ہی معلوم ہوتا ہے لیکن با وجود کوشش ان کے حالات سے حجاب نہ اٹھ سکا۔ حضرت داغ بھی ایک بار نواب خلد آشیاں سے رخصت لے کر کلکتہ گئے ہیں۔ اور اثنائے سفر میں انھیں کچھ دن پٹنہ عظیم آباد میں خوشگوار موسم کے انتظار میں ٹھہرنا پڑا ہے۔ جو اس شعر سے ظاہر ہے۔

ذرا چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں — عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

کلکتہ سے واپسی پر ان کے خیالات کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

[illegible]

یہ جسیں یہ حسین شہر اور یہ بہار بہار — داغ کلکتہ سے لاکھوں داغ دل پہ لیے چلے

حجاب کے متعلق یہ شعر اور بھی بیان کیا جاتا ہے۔

بھبھی ہے مجھے نصف بدن کی عشوہ — اللہ رے حجاب بدگمانی تیری

فدا علی خاں صاحب ابن امیر خاں بین کار سے معلوم ہوا کہ حجاب کا نام منی بائی تھا۔ اور حجاب تخلص ہے۔

حضرت غالب[1] اور میلے میں شریک ہونے کی حسرت

آپ کو یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت غالب بھی تو دربار رامپور سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں کہ وہ عہد خلد آشیاں میں زندہ تھے۔ انھوں نے میلے کے بارے میں اتنی گہری خاموشی کیوں اختیار کی اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ ضعف پیری کے باعث شرکت سے قطعی معذور تھے لیکن ان کا دل میلے ہی میں پڑا ہوا تھا چنانچہ وہ دور سے ہی میلے ۱۸۶۷ء کی خبر پاکر انھوں نے اپنا قطعہ تاریخ ایک خط کے ساتھ نواب صاحب کو بھیجا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے۔ نمائش گاہ سراسر سرور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں۔ اور خون جگر کھاتا ہوں۔ کہ ہائے میں وہاں نہیں۔ بالا خانے پر رہتا ہوں۔ اتر نہیں سکتا۔ تا ناکہ دو آدمی گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھایا۔ کیا چلے رہ آہن مرا اور راہ پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر

---

[1] حضرت غالب کے تفصیلی حالات کے لئے مختلف تذکرے کافی ہیں اور ہر ایک شہرت محتاج تفصیل نہیں

بے نظیر میں میری پالکی کہار، پالکی قفس۔ اور میں طائر اسیر۔ وہ بھی بے پر و بال۔
نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں۔ یہ سب بطریق فرض محال ہے
ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔ بارے تین بیت کا قطعۂ تاریخ
بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں[1]

نمائش گہے درخور شان خویش — برآراست نواب عالی جناب
بہ بیں چوں طرب را نہایت نماند — بود سال آں بخشش بے حساب
خدایا پسند و خداوندگار — کہ از طبع غالب دو پیچ و تاب

بخشش بے حساب کے ۱۲۸۵ھ ہوتے ہیں۔ بائے موحدہ ہے جب
وہ نہ رہی تو دو عدد گھٹے۔ اور ۱۲۸۳ھ رہ گئے۔ فہو المقصود۔ اگر حضرت کی
مرضی ہو تو دبدبۂ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب

غالب

۱۴ ماہ اپریل ۱۸۶۷ء

۱؎ ماخوذ از مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب رامپوری ناظم کتب خانہ

حضرت امیر مینائی اور میلہ

میلے کے متعلق حضرت امیر مینائی کی غزل کا ایک مقطع بھی نظر انداز کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ فرماتے ہیں۔

امیر جائیں گے ہم بھی بے نظیر ضرور
خبر ہے میلے میں اس مہ لقا کے آنے کی

اس غزل کا مطلع ہے۔

نہیں امید جو اس بے وفا کے آنے کی
میں راہ دیکھ رہا ہوں قضا کے آنے کی

۱۸۷۹ء کے میلے کا ایک قطعۂ تاریخ بھی اس قابل ہے کہ ناظرین کے روبرو پیش کیا جائے۔ یہ قطعۂ تاریخ مرزا علی حسن صاحب شاطر ملازم سرکار کے نتائج افکار سے ہے جو اخبار دبدبۂ سکندری مطبوعہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق ۴ اپریل ۱۸۷۹ء میں طبع ہوا ہے۔

چو در باغ آمدہ شاہ معظم　　پئے سیر و تماشا با کرشمہ
ندا از ساکنان عرش برخاست　　سبحان الذی اسریٰ بعبدہ

۱۲۹۶ھ

محفلِ رنگیں کی برہمی

آخر عہد میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ نواب صاحب نے ولی عہد صاحب کو بجبرے ہیں

بیٹھنے کا حکم دیا ہے جس کے متعلق دبدبۂ سکندری مطبوعہ ۱۰ اپریل ۱۸۸۶ء لکھتا ہے کہ " ۶ اپریل ۱۸۸۶ء کو میلے کا آخری دن تھا۔ روشنی کے وقت ولی عہد بہادر (نواب سید مشتاق علی خاں عرش آشیاں) کو حکم ہوا کہ جاؤ تم بجرے میں سوار ہو۔ ہم عقب سے آتے ہیں۔ حضور ولی عہد بہادر نے تعمیل کی۔ حضور پرنور ۱۲ بجے کے قریب تشریف لائے۔ بجرے میں سوار ہوئے۔ ایک بجے کے بعد حضور بجرے سے اترے۔ اترتے وقت ایک سائل نے عرض دی۔ سپاہی نے روکا۔ از راہِ ترحم فرمایا کہ عرضی لے لو۔ فی الفور چوبدار نے عرضی حضور کو دی۔ حضور نے اسی وقت آپ ملاحظہ کی اور حکم مناسب صادر فرمایا۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲ میلوں میں وہ میلا بھی شامل ہے جو ۲۹ مارچ ۱۸۸۷ء کو شروع ہوا تھا جب کہ نواب خلد آشیاں کا انتقال ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو جو میلے کا معین زمانہ تھا، ہو چکا تھا اور بجائے خلد آشیاں کے نواب سید مشتاق علی خاں عرش آشیاں ۲۹ مارچ ۱۸۸۷ء باغ بے نظیر کے میلے کو گئے تھے۔

ناظرین معاف فرمائیں۔ میں نے اکثر واقعات اگرچہ بخوف طوالت نظر انداز کر دیئے ہیں تاہم بیان طویل ہو گیا۔ لیکن کرنا بھی کیا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

سچ تو یہ ہے کہ عہدِ خلد آشیاں کی صحبتوں کو زمانہ صدیوں تک یاد

رکھے گا۔ جن کی طرف حضرت امیر مینائی نے بھی ایک شعر میں اشارہ کیا ہے

کہاں ہم اے امیر اب اور کہاں داغ   وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

یہ شعر اس وقت کہا گیا تھا جب کہ حضرت داغ یہ شعر کہتے ہوئے حیدرآباد جا چکے تھے اور حضرت امیر مینائی رامپور میں موجود تھے۔

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ   وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں تک

حضرت داغ جب حیدرآباد پہنچ گئے ہیں اور اعلیٰ مراتب پر فائز ہو چکے ہیں اس وقت بھی انھیں دربار رامپور کی یاد بے چین کرتی رہتی تھی چنانچہ حیدرآباد سے ایک غزل امیر مینائی کو بھیجی تھی جس کے دو شعروں میں دل کی تڑپ کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ غزل "مہتاب داغ" میں شائع ہو چکی ہے۔

یاد آتے ہیں وہ اشخاص مصاحب منزل   دو گھڑی جلسہ وہ احباب کے مشاغل اپنا
نہیں اکثر کا پتہ اور جو کچھ باقی ہیں   ان سے ملنے کو تڑپتا ہے بہت دل اپنا

منشی امیر اللہ تسلیم نے بھی یہی رونا رویا ہے۔

ہماری شاعری تسلیم تھی کلب علی خاں تک   ذلیل و خوار ہم پھرتے ہیں وہ تھے سو ہیں مدفن میں

حضرت منصور رامپوری پر بھی اس قابل رشک بزم کے درہم برہم ہونے کا خاص اثر ہوا تھا۔ اور خلد آشیاں کی پہلی برسی پر وہ اپنے تاثرات کو روکنے پر قادر نہ ہو سکے تھے۔

وہ نہ متوالے نہ وہ غل ہائے کیا تھا کیا ہوا   بزم مینا ہے نہ قلقل ہائے کیا تھا کیا ہوا

اس خزاں کا ہو برا کیسی بہاریں لٹ گئیں — گل نہ نسریں ہے نہ سنبل ہائے کیا تھا کیا ہوا
شاخِ گل پر چہچہے ہیں اور نہ کوکو سرو پر — اب نہ قمری ہے نہ بلبل ہائے کیا تھا کیا ہوا
شورِ قلقل جن کی محفل میں کہ کل تھا ہم نشیں — آج ان کا ہو گیا قتل ہائے کیا تھا کیا ہوا
یا بہاریں تھیں یہاں یا اب مزاریں ہو گئیں — ہم اسی غم میں گئے گھل ہائے کیا تھا کیا ہوا
اب غزل خواں ہے نہ محفل ہے نہ ساقی ہے نہ جام — اور نہ مینا ہے نہ قلقل ہائے کیا تھا کیا ہوا
وہ تماشا اور نہ سولی وہ نہ منصور اور ہجوم — اور انا الحق کا وہ غل ہائے کیا تھا کیا ہوا

اس کے بعد نواب عرش آشیاں نے اپنے عہد میں دو سال میلے کئے اور عہدِ کونسل آف ریجنسی میں بھی چند سال گنیش گھاٹ کے قریب میلے ہوئے جو باغ بے نظیر کے میلے ہی کے نام سے موسوم کئے گئے لیکن ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد اس میلے کی روایات کو از سر نو زندہ کرنے کا سہرا اعلیٰحضرت ہز ہائینس نواب سر سید رضا علی خاں بہادر دام اقبالہم آخری تاجدار ریاست کے سر ہے جنھوں نے موجودہ زمانے کے مذاق کے مطابق بینظیر کے میلے کو ترقی یافتہ صورت دے کر ایک شاندار نمائش کی صورت میں ۱۹۴۲ء سے جاری فرمایا ہے جو ہر سال ماہ مارچ میں دو ہفتے تک رہتا ہے۔

میر یار علی جان صاحب اور ان کا تہنیتی مسدس

جس میلے کے تفصیلی حالات دوسرے شعرا کی زبانی آپ ملاحظہ کر چکے۔ اسی میلے پر میر یار علی جان صاحب نے

ریختی میں ایک مسدس لکھا ہے۔ یہ مسدس خود ان کا ہاتھ کیا ہوا کتب خانۂ عالیہ رامپور میں موجود ہے جس سے نقل کر کے موجودہ نسخہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مسدس میں بے نظیر کا میلا اپنے نئے روپ۔ نئے بناؤ سنگھار اور نئی دلربا اداؤں کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے گا لیکن بہتر ہوگا کہ اس کے پڑھنے سے پہلے جان صاحب کے ضروری سوانح حیات بیان کر دیئے جائیں۔

جانؔ صاحب کے حالات

میر یار علی نام۔ جان صاحب تخلص۔ ابن میر امن شاگرد نواب عاشور علی خاں لکھنوی۔ وطن لکھنؤ۔ ریختی گویوں میں یکتا تھے۔ صاحب طبع رسا تھے لکھنؤ میں ان کا مکان رستم نگر میں تھا۔ ۱۸۱۸ء سال ولادت ہے۔ خمخانۂ جاوید لکھتا ہے کہ جان صاحب کہنے بھی اچھا تھے اور پڑھنے بھی اچھا تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس میں شریک ہوتے تھے۔ اور پڑھنے میں وہ ناز آفرینیاں دکھاتے تھے۔ کہ سامعین ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں بتلاش معاش دہلی گئے۔ وہاں سے بھوپال، ٹگرنا کا ہم واپس آئے۔ ان کا دیوان ۱۸۴۷ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ اس کے بعد مطبع نظامی بدایوں، لکھنؤ، کانپور اور حیدرآباد وغیرہ مختلف شہروں میں شائع ہوتا رہا۔

تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب میں سید محمد مبین صاحب نقوی الہ آبادی تحریر کرتے ہیں کہ شاہی کے بعد لکھنؤ میں کس مپرسی کا عالم تھا۔ اس وقت

فہرست کا لکھنا بھی اظہار نامہ ہی　سرکار جب پڑھیں گی تو دربار نامہ ہی

ہی فکر خاتمہ کی کہا کارنامہ ہی　[illegible]

کر کر کی مختصر یہ اسم نویسی تمام کی

تو نام لے سے انعام پاؤنگی



میر یار علی عرف جان صاحب ریختی گو

رامپور میں نواب کلب علی خاں لکھنؤ والوں کی قدر کرتے تھے۔ وہاں علما، شعرا اور اہل ہنر و کمال کا مجمع تھا۔ اس لئے جان صاحب بھی آخر عمر میں وہیں پہنچ گئے اور درباری شعرا میں داخل ہو گئے۔

مزید حالات دریافت کرنے کی غرض سے جان صاحب کے رشتہ داروں کا پتہ چلایا گیا۔ حضرت محمد حسین صاحب سابق داروغہ باغات عمر ۸۴ سال ساکن محلہ لال تبرلے جو جان صاحب کے نواسے تھے ان کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے محمد حسین صاحب کا بیان ہے کہ جان صاحب کی تنخواہ نوے روپیہ ماہانہ تھی۔ لیکن ہر مہینے میں نواب خلد آشیاں جان صاحب کو یاد فرمایا کرتے تھے اور ہر مرتبہ دو دو اشرفیاں بطور انعام عطا فرماتے تھے۔ اور پرورش کی صرف یہی ایک صورت نہ تھی بلکہ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا تھا یعنی ہر سال چار چہرے (یعنی چار فوجی آسامیاں) جان صاحب کو دی جاتی تھیں تاکہ معقول رقم لے کر یہ آسامیاں جن اشخاص کو چاہیں دے دیں۔ ان کو چہرہ کہتے تھے۔ ہر چہرہ کم سے کم ایک سو روپیہ کو فروخت ہوتا تھا۔ عیدین کا انعام جداگانہ تھا اور ان سب پر طرہ یہ تھا کہ سال کے ختم پر کل قرض جس کی تعداد ہزار آٹھ سو کے درمیان ہوتی تھی سرکار سے ادا کر دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ جان صاحب کے انتقال کے بعد بھی ان کی بیوی کو دو چہرے عطا فرمائے گئے تھے۔

ایک مرتبہ نواب صاحب نے فرمایا کہ جان صاحب! میں نے نئی طرح

غزل لکھی ہے۔ اور چند اشعار پڑھکر سنائے۔ جان صاحب چپ رہے۔ نواب صاحب نے پھر توجہ دلائی تو جان صاحب نے عرض کیا کہ سرکار! میں تو ۴ سال پہلے اس طرح میں غزل لکھ چکا ہوں۔ نواب صاحب خاموش ہو گئے اور دو سال تک طلب نہیں فرمایا۔ تنخواہ بدستور ملتی رہی۔ دو سال بعد میر احمد علی جمعدار چوبداران جان صاحب کے داماد سے فرمایا کہ جان صاحب کو بلاؤ۔ جان صاحب حاضر ہوئے اور مندرجہ ذیل غزل عرض کی جس میں اپنی خودداری اور حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

غزل

بُرے جو حرف تھے قسمت کے وہ تحریر میں آئے
زمانے کے بڑا حصہ مری تقدیر میں آئے

میں وہ ہوائی نہیں لیلےٰ کی اور مجنوں کی سنا لی ہو
ہر منصب ہے غم جنگل نہ کیوں جاگیر میں آئے

چلی تو سمجھیانے ہو سمجھکر بات کرنا تم
نہ بے ڈھب کوئی کلمہ اے لب تقریر میں آئے

بڑا نقشہ کروں اس کا قلم ہو ناک مانی کی
جو کچھ بھی نقص اے نبو مری تصویر میں آئے

کنوئے میں گر کے مر جاؤں اٹھالو ہاتھ جینے سے
قسم اس سر کی باجی فرق گر توقیر میں آئے

زلیخا وہ نہیں جو رسوا ہوئی یوسف کی چاہت میں
نہ مانوں حکم یہ قرآن یا تفسیر میں آئے۔

پنہلانے سوت کو گہنا مرا دم دے کے سے جلتے
زنانی جان صاحب تھے علی تدبیر میں آئے۔

اس کے بعد حسب دستور طلبی ہونے لگی اور عنایات و انعامات کا اجراء حسب سابق ہونے لگا۔

محمد حسین صاحب نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ جان صاحب ایک مرتبہ رامپور سے رخصت لے کر واجد علی شاہ کے پاس کلکتہ گئے تھے اور انتزاع سلطنت کی تاریخ پیش کی تھی جس پر پانچ سو روپیہ اور دو دوشالے مرحمت ہوئے

نے سر کھانہ خون بہا نافٹ ٹل گئی ۔۔۔۔۔ ایام کی خرابی سے گدی نکل گئی

لیکن مصرع ثانی سے ۱۲۷۱ھ ثابت ہوتے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے یہ شعر اگرچہ مادۂ تاریخ کے طور پر نہیں لکھا گیا لیکن مضمون کی مناسب رعایتوں اور محاورات کے استعمال کے باعث بہت کامیاب شعر کہا جا سکتا ہے۔

جان صاحب رامپور میں قلعہ سے شمال کی طرف گھیر مصری خاں میں رہتے تھے۔ یہ حصہ اب قلعہ میں آگیا ہے۔ جان صاحب کا حلیہ تھا۔ پستہ قد رنگ گندمی کھلتا ہوا۔ گول چہرہ۔ داڑھی خشخشی۔ عرض کے پائچے کا پاجامہ پہنتے تھے۔ بغیر کرتے کے انگرکھا اور ترچھی گوشیا ٹوپی استعمال کرتے تھے جو تہا تقریبا اور بدلہ سنج تھے۔ رامپور کے کسی مشاعرے میں زنانہ لباس پہنکر جانے کا جانے کا حال کسی سے ثابت نہیں ہوا۔ پاجامہ عورتوں کی طرح عرض کے پائچے کا ہوتا ہی تھا البتہ کمر سے جو پٹکا باندھتے تھے وہ مشاعرے میں پڑھنے کے وقت

کمر سے کھول کر اس کا پلّو سر پر ڈال لیا کرتے تھے۔ اُن کی چار بیٹیاں تھیں جن میں سے تین کی شادیاں رامپور میں ہوئی تھیں۔ تین داماد جعفر حسین صاحب میر احمد علی صاحب اور مبارک شاہ خاں رامپوری (مذہب اہل سنت) رامپور ہی میں رہے۔ میر عبداللہ صاحب سے چوتھی بیٹی کا نکاح لکھنؤ میں ہوا اور وہ وہیں رہے۔ محمد حسین صاحب کی والدہ جان صاحب کی بڑی بیٹی تھیں جن کی شادی جعفر حسین صاحب سے ہوئی تھی۔ اب ان سب کا انتقال ہو چکا۔ ڈاکٹر فدا حسین صاحب ساکن محلہ قصاب خانہ اور وزیر علی خاں صاحب کورٹ انسپکٹر سے بھی معلوم ہوا کہ آخر عمر میں جان صاحب پر مرض برص پوری طرح غالب ہو چکا تھا۔

جان صاحب کے انتقال کے سلسلے میں تحقیق سے چند اختلافات پیدا ہوگئے۔ خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ جان صاحب ستر برس سے زیادہ عمر پا کر انتقال کر گئے۔ یہ بیان اس قدر مجمل ہے کہ اس سے نہ عمر کا تعین ہوتا ہے نہ سال وفات اور نہ مقام انتقال کا۔ البتہ تاریخ نظم و نثر اردو میں سال وفات ۱۸۹۶ء تحریر ہے اور عمر ۷۰ سال۔ لیکن یہ اس لئے غلط ہے کہ انتخاب یادگار کی رو سے ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں ان کی عمر ۴۲ سال ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے ۱۸۹۶ء میں ان کی عمر ۶۵ سال ہونا چاہیئے نہ کہ ۷۰ سال۔ خمخانۂ جاوید عمر ۷۰ سال سے زائد تحریر کرتا ہے اس لئے قیاس یہ ہے کہ

تاریخ نظم و نثر اُردو نے عمر کے بارے میں خمخانۂ جاوید کی بیان کی ہوئی ۶۳
فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ تذکرہ "خندہ گل" نے مقام انتقال تو رامپور ظاہر کیا ہے
لیکن سال وفات کے بارے میں اس نے کمال کیا ہے۔ کہ جان صاحب کو
۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء ہی میں پیوند خاک کر دیا ہے۔ تذکرہ ریختی مرتبہ تمکین کاظمی میں بھی
۷۳ سال کی عمر اور ۱۲۹۷ھ میں رامپور میں مدفون ہونا تحریر ہے۔

محمد حسین صاحب جان صاحب کے نواسے کے بیان نے ان تمام غلط فہمیوں کو
دور کر دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جان صاحب کا انتقال نواب خلد آشیاں کے
انتقال سے ایک سال پہلے یعنی ۱۸۸۶ء میں رامپور میں ہوا۔ اور شاہ رفیق کے
تکیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اس طرح یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ جان
صاحب نے ۷۶ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء / ۱۳۰۳ھ میں بمقام رامپور انتقال کیا۔

تہنیتی مسدس کی تشبیبیں: جان صاحب نے اپنے مسدس میں جن ارباب کمال کا ذکر کیا ہے۔ ان کی درجہ بندی حسب ذیل ہے

See Rekhta [illegible] diwan of Jan Sahab [illegible]

شعرا

۱ ۔ حضرت اسیر
۲ ۔ حضرت امیر مینائی
۳ ۔ حضرت جلال لکھنوی
۴ ۔ حضرت داغ دہلوی

۵۔ میرزکی

۶۔ جان صاحب۔

اہلکارانِ سرکاری

۷۔ وزیر علی خاں خانساماں

۸۔ شیخ وجیہ الزماں خاں

۹۔ میر بہادر علی صاحب مصاحب

۱۰۔ میر فدا علی جمعدار چوبداران

۱۱۔ اچھے صاحب سوزخواں۔

۱۲۔ مظفر حسین خاں۔

۱۳۔ احسان حسین خاں۔

داستان گویان

۱۴۔ حکیم اصغر علی

۱۵۔ میر احمد علی

۱۶۔ قاسم علی

۱۷ میر نواب

۱۸۔ سید علی

۱۹۔ منشی انبا پرشاد رسا

۲۰۔ غلام مہدی

۲۱۔ غلام رضا

اہل موسیقی

۲۲۔ بہادر حسین خاں نائک

۲۳۔ امیر خاں بین بجانے والا

۲۴۔ حسو خاں گویا

۲۵۔ سُبتا گویا

۲۶ اتو خاں گویا
۲۷ رحیم اللہ خاں
۲۸ علیم اللہ خاں گویا و طبلچی
۲۹۔ کاظم علی خاں ۔ قوال
۳۰۔ باقر علی خاں گویا
۳۱۔ مودھو طبلچی
۳۲۔ چھپدا خاں طبلچی

۳۳۔ حیدر بخش سارنگی نواز
۳۴۔ مندرو۔ سارنگی نواز
۳۵۔ نثار علی
۳۶۔ امیر علی شہنائی نواز
۳۷۔ ننّے خاں معشوق ساز
۳۸۔ مراد علی خاں۔
۳۹۔ علی جان۔ رقاص۔

طوائفیں

۴۰۔ داروغہ محبوب جان
۴۱۔ لذت بخش
۴۲۔ نورتن
۴۳۔ جینو
۴۴۔ ممّی
۴۵۔ اللہ رکھی

۴۶۔ نئی کلکتے والی
۴۷۔ عبّاسی
۴۸۔ عزیزن
۴۹ ہینگن جان
۵۰۔ بندی جان

کنیزیں

۵۱۔ ننھیا
۵۲۔ چنّی

منجملہ شعراء کے اسیر[۱]، امیر[۲]، جلال[۳]، داغ[۴]، ذکی[۵] کے حالات اور ارباب موسیقی میں سے بہادر حسین خاں[۶] نائک۔ امیر خاں[۷] بین کار، حیدر بخش[۸] سارنگی نواز، محمد حسین[۹] طبلچی، ممی[۱۰] طوائف اور باقر علی خاں[۱۱] گویّے کے حالات منیر شکوہ آبادی کے نمبر سے زنجیر کے سلسلے میں لکھے جا چکے ہیں۔ جان[۱۲] صاحب کے حالات پر جداگانہ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ باقی شخصیتوں کے حالات ملاحظہ ہوں۔

وزیر علی خاں خانساماں[۱۳]

(نبی حسن صاحب خانساماں ابن ظہور الحسن صاحب خواجہ وزیر علی خاں کے پوتے سے معلوم ہوا کہ)

خواجہ محمد وزیر علی ابن احمد علی بعہد نواب خلد آشیاں خانساماں کے عہدے پر ممتاز تھے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد تھے۔ قدیمی سند اہلکار تھے۔ وطن قدیم دہلی تھا۔ وہاں سے شاہجہاں آئے۔ پھر رامپور میں سکونت اختیار کی۔ دیانت میں مشہور تھے۔ ان کی علالت کے زمانے میں نواب خلد آشیاں خود ان کے مکان پر عیادت کو گئے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں رامپور ہی میں انتقال کیا۔ اور مولانا جمال الدین صاحب کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ خانساماں کے عہدوں پر اب تک ان ہی کے خاندان کے افراد بوجہ دیانت موروثی ممتاز ہیں۔

شیخ وجیہ الزماں خاں

جان صاحب نے اپنی مسدس کے بند ۸۶ میں جہاں دانشمندوں کا
ذکر کیا ہے اس کے نیچے شیخ صاحب کی تصویر بصراحت نام درج ہے
اس لئے ان کے حالات لکھے گئے۔ مولوی وجیہ الزماں خاں نام، رنجور تخلص
ابن منعم الزماں خاں۔ قصبہ فرخ آباد عرف پلاواں ضلع بجنور صوبہ اودھ میں
پیدا ہوئے۔ محکمہ صدر آگرہ (ہائیکورٹ) میں مدت تک سررشتہ دار رہے
نواب سید محمد سعید خاں جنت آرامگاہ کے عہد میں رامپور میں آئے۔ ریاست کی
طرف سے پولٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں سفیر ریاست مقرر ہوئے۔ بصلۂ خدمات
غدر ۱۸۵۷ء ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو لارڈ کیننگ نے بمقام شیخ گڑھ دو ہزار روپیہ کا
خلعت عطا کیا۔ ریاست نے بہت قدر دانی کی۔ مولوی صاحب عابد پرہیزگار
تھے ۶۴ سال کی عمر میں بدھ کے دن ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۹ھ کے مطابق
۹ جولائی ۱۸۷۲ء بعارضہ بواسیر رامپور میں انتقال کیا۔ اور اپنے مرشد حضرت
میاں امیر شاہ صاحبؒ کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔

(ملاحظہ ہو اخبار دبدبۂ سکندری ۱۵ جولائی ۱۸۷۲ء) شیخ وجیہ الزماں خاں
امیر مینائی کے خسر تھے۔ امیر مینائی انہیں کی وساطت سے دربار رامپور میں باریاب
ہوئے تھے۔

میر مجاور علی

درحمت حسین صاحب ابن عنایت حسین صاحب عمر ۸۰ سال ہمشیرزادہ میر مجاور علی صاحب نے بیان کیا۔

میر مجاور علی نام۔ محب تخلص۔ ابن میر قربان علی۔ وطن دلی۔ خط نستعلیق میں میاں رحیم اللہ خوشنویس کے شاگرد تھے۔ شعر و سخن میں میر احمد علی رسا رامپوری سے تلمذ تھا۔ دلی سے رامپور آئے۔ خلد آشیاں کے ہم مکتب تھے۔ اور مزاج میں دخیل تھے۔ مصاحبین میں نام درج تھا۔ ان کی عمر سنہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳م میں ۴۰ سال کی تھی۔ ملا ظریف کی بزریہ میں رہتے تھے۔ جہاں اب قلعہ کے شمالی و مغربی گوشے کا برج ہے۔ مکان نواب خلد آشیاں نے اپنے صرف سے پختہ تعمیر کرا دیا تھا۔ اور بہ نفس نفیس مکان کے ملاحظہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

ان کا انتقال ۷۰ سال کی عمر میں رامپور میں سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۰۳ء کے درمیان ہوا۔ اور قبرستان محلہ الٰہی عصمت خاں میں دفن ہوئے۔ میر مجاور علی صاحب کے بڑے بیٹے میر صفدر حسین صاحب تھے جو داروغہ باورچیخانہ تھے ان کا انتقال باعلان مذہب اہل سنت ذیقعدہ سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق مئی سنہ ۱۸۹۳ء رامپور میں ہوا۔

(ملاحظہ ہو اخبار دبدبۂ سکندری مطبوعہ ۲۹ مئی سنہ ۱۸۹۳ء)

میر فدا علی

میر فدا علی نام۔ لکھنؤ وطن۔ خلد آشیاں کے عہد میں چوبداروں کے جمعدار تھے۔ بذریعہ ملاّ ظریف میں رہتے تھے۔ رامپور میں شادی ہوئی۔ محمد حسین صاحب جان صاحب کے نواسے سے معلوم ہوا کہ میر فدا علی کا انتقال رامپور میں ۱۸۸۸ء یا ۱۸۸۹ء میں ہوا

اچھے صاحب سوزخواں

فرخ حسین صاحب عمر ۵۰ سال ساکن محلہ لال قبر سابق ملازم امام باڑہ نبیرہ اچھے صاحب سوزخواں سے معلوم ہوا کہ

سید امداد حسین نام۔ اچھے صاحب عرف۔ وطن لکھنو۔ ۱۸ سال کی عمر میں بعہد نواب سید یوسف علی خاں لکھنؤ سے رامپور آئے۔ خلد آشیاں کے عہد میں سوزخواں اور مصاحب تھے۔ پچاس روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ میر علی صاحب کے خاندان سے تھے۔ جو لکھنؤ کی حکومت میں سوزخوانوں میں بے مثل مانا جاتا تھا۔ میر علی صاحب حسین آباد کے عقب میں کالے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ جن کی قبر اب بھی موجود ہے۔

اچھے صاحب عہد نواب سید مشتاق علی خاں عرش آشیاں تک

زندہ رہے سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۴ء کے درمیان ان کا انتقال ۶۰ سال کی عمر میں رامپور میں ہوا۔ محلہ نالا پار کے عام قبرستان میں دفن ہوئے۔ سید امداد حسین صاحب عرف اچھے صاحب کے بیٹے میر بہادر حسین صاحب سوزخوان تھے جو نواب جنت مکان کے عہد میں ملازم تھے۔ ان کا انتقال بھی رامپور میں ہوا اور قبرستان موسوم بہ مقابر مومنین میں دفن ہوئے۔ اچھے صاحب کے بازو ان کے چھوٹے بھائی منجھو صاحب سوزخوان تھے۔

احسان حسین خاں [12]

جان صاحب نے احسان حسین خاں کا تعارف مسدس کے اشعار میں بحیثیت وکیل سرکار کرایا ہے چونکہ حالات معلوم نہ ہو سکے اس لئے مجبوراً انکی وفات کے قطعۂ تاریخ پر جو منیر شکوہ آبادی نے لکھا ہے اکتفا کیا گیا۔

تاریخ رحلت جناب عالی احسان حسین خاں بہادر لکھنوی

احسان حسین خان بہادر ذی جاہ انجم بیاں   قابل قانون فنون دبیر یکتا، ہمہ روشن رائے
در کرب و بلا روضۂ پاک حسین آسودہ بخاک   بگرفتہ بجنت نخل طوبیٰ زین کہنہ سرائے

تاریخ وفاتش بہ ہزاران اندوہ نوشت منیر
بے مثل امیر بود نامی حقا افسوس اے وائے
۱۳۰۹

مظفر حسین خاں [۱۳]

یہی حال مظفر حسین خاں برادر احسان حسین خاں کا ہے جن کا قطعۂ تاریخ رحلت پیش کیا جاتا ہے

والا گہر جناب مظفر حسین خاں — دیندار و دیں پناہ و مددگار اہلبیت
ذی شان و ذی مکارم و ذی قدر و نامدار — غمخوار مصطفےٰ و عزادار اہلبیت
واحسرتا کہ رفت ازیں رہروان سرا — آں ناقل فضائل و آثار اہلبیت
چوں رفت از جہان طرف جنت النعیم — از غیب یافت دولت دیدار اہلبیت

رضوان نیر گفت چنیں سال رحلتش
نامی گلے رسید بہ دربار اہلبیت

۱۲۹۲ھ

داستاں گویاں

حکیم اصغر علی صاحب علیہ الرحمہ

حضرت سید انوار حسین عرف منجھو صاحب آرزو تخلص لکھنوی سے معلوم ہوا کہ میر اصغر علی صاحب نواب سید یوسف علی خاں فردوس مکاں کے

عہد میں داستاں گوئی کے سلسلے میں ملازم ریاست ہوئے تھے اور اسی لگاؤ سے ان کے صاحبزادے حضرت سید ضامن علی جلال لکھنوی نواب خلد آشیاں کے عہد میں دربار رامپور میں پہنچے۔

میر اصغر علی صاحب نے مندرجہ ذیل داستانیں تصنیف کی ہیں جو کتابخانہ سرکاری میں محفوظ ہیں۔

۱۔ ایرج نامہ بہ سال ۱۲۷۵ھ	۶۔ داستان غزالہ
۲۔ داستان طلسم جادو	۷۔ قصہ باد و پردیں
۳۔ داستان طلسم ہوشربا	۸۔ قصہ سمن و ماہ پیکر
۴۔ طلسم ہفت کوکب۔ تعمیر خسرو باغ	۹۔ قصہ روشن جمال
۵۔ داستان شمائلہ باختر	۱۰۔ شورش عشق

انتقال ۱۲۹۶ھ میں ہوا۔

میر احمد علی داستان گو ۱۵

میر احمد علی صاحب نواب فردوس مکاں کے عہد میں داستاں گوئی کے سلسلے میں ملازم ریاست تھے۔ وطن لکھنؤ تھا۔ داستاں گوئی میں استاد مانے جاتے تھے۔ ان کے بعض شاگرد بھی داستاں گوئی میں صاحب شہرت ہوئے ہیں ان کے نامی شاگرد حکیم سید اصغر علی صاحب تھے۔ دوسرے شاگرد رشید

منشی انبا پرشاد رساؔ تھے۔ میر احمد علی صاحب کی تصنیف سے طلسم ہوش ربا (نولکشور) سرکاری کتابخانے میں موجود ہے۔

قاسم علی[16]

قاسم علی کے حالات دریافت نہ ہو سکے۔

میر نواب[17]

(حسب بیان مرزا للن صاحب ابن میرزا رحیم الدین حیاؔ تخلص میر نواب نام۔ وطن لکھنؤ۔ داستان گوئی میں ملازم ریاست تھے۔ سو ۵ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ رامپور میں چوک محمد سعید خاں میں رہتے تھے۔ ستر سال کی عمر میں ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان ان کا انتقال رامپور میں ہوا۔ اور یہیں دفن ہوئے۔ ان کے نواسے یوسف حسین خاں عرف سعد (علاقہ مقبرہ جناب عالیہ کے متصل رہتے ہیں۔ ان کے بیٹے حیدر مرزا تصور تخلص کرتے تھے جنھوں نے گلستان مقال تصنیف کی ہے۔

میر سید علی[18]

فدا علی خاں پسر امیر خاں بین کار سے معلوم ہوا کہ سید علی صاحب کا

وطن لکھنؤ تھا۔ داستان گوئی کے سلسلے میں بزمانۂ نواب خلد آشیاں ملازم ریاست تھے
ان کا انتقال ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۵ء میں رامپور میں ہوا۔ تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان میں
دفن ہوئے۔ ان کے بیٹے سید حسین نواب جنت مکاں کے عہد تک رہے۔

سید حسین کی تصنیف سے داستان امیر حمزہ جدید موسوم بہ "گنبد مبہم" ہے
مرزا محسن صاحب سے معلوم ہوا کہ سید حسین دو محلے میں رہتے تھے۔ ہر جمعہ کو
ان کے مکان پر داستان گوئی کا جلسہ ہوتا تھا۔ سید حسین صاحب کا انتقال
رام پور میں ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں ہوا۔

منشی انبا پرشاد رسا [۱۹]

منشی انبا پرشاد رسا تخلص۔ ابن لالہ بہاری پرشاد۔ وطن لکھنؤ۔ داستان
گوئی میں مشہور تھے۔ عہد نواب محمد سعید خاں جنت آرامگاہ میں ریاست رامپور میں
ملازم ہوئے۔ سنہ ۱۲۹۰ / ۱۸۷۳ میں ان کی عمر ۸۵ سال تھی۔ شاعری میں رسا تخلص
کرتے تھے۔ مرزا محمد تقی خاں ہوس کے شاگرد تھے۔ (انتخاب یادگار) ان کا نام
اسلام لانے کے بعد عبد الرحمٰن رکھا گیا۔ (ملاحظہ ہو اخبار الصنادید) فدا علی خاں
پسر امیر خاں مین کار سے معلوم ہوا کہ رسا کا انتقال ۹۷ یا ۹۹ سال کی عمر میں
۱۸۸۵ اور ۱۸۸۷ء کے درمیان لکھنؤ میں ہوا۔

ان کے تصنیف کئے ہوئے داستانوں کی تفصیل نیچے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ سخن سنج ۱۲۴۵ھ میں تصنیف کی	۷۔ داستان فرخ شاہ سوار
۲۔ داستان امیر حمزہ۔ بعہد ظل آشیانی	۸۔ ملکہ شمشاد وسہی قامت
۳۔ چہار رنگ۔	۹۔ فرخ شاہ سوار قلندر
۴۔ کوچک باختر	۱۰۔ داستان ناہید باغبان
۵۔ ناقص الآخر	۱۱۔ داستان ہاشم تیغ زن
۶۔ داستان سلطانہ شانہ	۱۲۔ نوشیرواں نامہ

غلام مہدی [۲۰]

غلام مہدی منشی انبا پرشاد رسا کے بیٹے تھے۔ شاعر تھے۔ داستان گوئی میں بھی شہرت تھی۔ حسب بیان فدا علی خاں، منشی غلام مہدی کا انتقال اسی برس کی عمر میں رامپور میں ہوا۔

غلام رضا [۲۱]

نام غلام رضا۔ لکھنؤ وطن۔ پسر دوم منشی انبا پرشاد رسا۔ شاعری میں رضا تخلص تھا۔ بواسطہ پدر سلسلۂ تلمذ۔ مرزا محمد تقی خاں ہوس تک پہنچتا ہے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۲ء میں ان کی عمر ۴ سال تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب وہ لکھنؤ چھوڑ کر اپنے والد کے ساتھ رامپور میں ساکن ہوئے تھے تو ان کی عمر دس سال کی تھی

بشیر الدین خاں صاحب عرف چھٹن خاں صاحب ساکن محلہ کٹرہ جلال الدین سے معلوم ہوا کہ غلام رضا کا عرف "چھوٹے مرزا" تھا۔ حلیہ یہ تھا: پستہ قد، دوہرا جسم، رنگ سانولا۔ داڑھی منڈھی ہوئی۔ غلام رضا کا مکان چھٹن خاں صاحب کے مکان کی برابر تھا۔ ہر جمعہ کو ان کے مکان پر داستاں گوئی کا جلسہ ہوتا تھا۔ ان کی صرف ایک بیٹی تھی جن کا نام چھمن تھا۔ داستاں گوئی کے سلسلے میں بعہد نواب خلد آشیاں ملازم تھے۔ ۵۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء رامپور میں ہوا۔ اور محلہ اہلی عصمت خاں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

معلوم ہوا کہ مندرجہ ذیل داستانیں اُن کی تصنیف شدہ کتابخانہ سرکاری میں موجود ہیں۔

۱۔ طلسم ہوشربائے باطن ۲۔ طلسم باطن ہوشربا۔

بقیہ ارباب موسیقی

حسّو خاں

(حسب بیان حبیب الرحمٰن خاں) حسّو خاں نام۔ رامپور کا باشندہ تھا نواب خلد آشیاں کے عہد میں ملازم سرکار رہا۔ ٹھمری گانے میں مشہور تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں اس کے بھائیوں کو وحید الدولہ۔ رضی الدولہ اور بشاشت الدولہ کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ ۱۸۷۹ء یا ۱۸۸۰ء میں بعہد

خلد آشیاں رامپور میں انتقال ہوا اور محلہ کنڈے کے قبرستان میں دفن ہوا۔

سبا گویا [25]

(حسب بیان حشمت جان طوائف، عمر ۷۰ سال) سبا گویا حشمت جان کا دادا تھا۔ خلد آشیاں کے عہد میں سرکاری ملازم تھا۔ انتقال رامپور میں ہوا اور حضرت شاہ بغدادی صاحب کے احاطہ مزار میں دفن ہوا۔ جان صاحب نے اپنی مسدس میں ممی اور چپو کو بیٹیاں ظاہر کیا ہے۔

الو خاں گویا [26]

(حسب بیان حبیب الرحمن خاں) الو خاں رامپور کا باشندہ تھا۔ محلہ راجدوارے میں رہتا تھا۔ سرکاری ملازم تھا۔ گانا خوب تھا۔ انتقال ۷۵ یا ۸۰ سال کی عمر میں ۱۸۸۲ء میں رامپور میں ہوا اور کنڈے کے قبرستان میں دفن ہوا۔

رحیم اللہ خاں [27]

(حسب بیان حبیب الرحمن خاں) رحیم اللہ خاں کا وطن دلی تھا۔ خیال گانے کا استاد تھا۔ مہتمم چوکی خانہ تھا۔ عظیم اللہ خاں اس کا بھائی تھا۔ انتقال رامپور میں ۱۸۸۹ء میں ہوا۔

عظیم اللہ خاں ۲۸

(حسب بیان حبیب الرحمٰن خاں) عظیم اللہ خاں کا وطن بھی دلّی تھا۔ خیال گانے میں یہ بھی استاد تھا طبلہ چھپا بجاتا تھا۔ انتقال کا سال دہی ہے جو اس کے بھائی حسیم اللہ خاں کا ہے۔

کاظم علی خاں قوّال ۲۹

(حسب بیان حبیب الرحمٰن خاں) کاظم علی خاں کا وطن دلّی تھا۔ سرکاری ملازم تھا حضرت امیر خسرو کے ایجاد کئے ہوئے انقاموں میں سے "قول" اور "قلبانہ" سے واقف تھا۔ ۵۰ سال کی عمر میں بعہد نواب خلد آشیاں رامپور میں انتقال ہوا۔

چھجّا خاں ۳۲

حسب بیان حکیم سید الیاس صاحب ساکن راجدوارہ طبیب سرکاری۔ چھجّا خاں رامپور کا قدیمی باشندہ تھا۔ امیر خاں بین کار سے خاص تعلقات تھے۔ راجدوارے میں مکان تھا طبلے کا استاد تھا۔ ملازم سرکار تھا ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ اور محلہ کنڈے کے قبرستان میں دفن ہوا۔

مندرو خاں ۳۴

(حسب بیان حبیب الرحمن خاں) مندرو خاں رامپور کا قدیمی باشندہ محلہ ساجدہ دارے میں رہتا تھا۔ سرود بجانے میں ماہر تھا۔ ابتدا مہاراجہ نیپال کے ملازم رہا۔ عہد خلد آشیاں میں آکر سرکاری لازم ہوا۔ ستر یا چہتر سال کی عمر میں ۱۳۰۳ھ یا ۱۸۸۵ء میں رامپور میں انتقال ہوا۔ اور محلہ کنڈے قبرستان میں دفن ہوا۔

نثار علی پکھاوجی ۳۵

(حسب بیان حبیب الرحمن خاں) نثار علی خاں نام۔ باپ کا نام حاجی ولایت علی۔ پکھاوج اور طبلہ دونوں کا ماہر تھا۔ اور دونوں فنون میں اپنے والد کا شاگرد تھا۔ سرکاری ملازم تھا۔ وطن غالباً لکھنؤ تھا۔ انتقال کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

امیر علی شہنائی نواز ۳۶

(حسب بیان محمد اسمٰعیل خاں صابر) امیر علی نام۔ وطن لکھنؤ۔ بعہد نواب خلد آشیاں ملازم سرکاری تھا۔ شہنائی بجانے میں ماہر تھا۔ ۶۰ سال کی عمر میں

۱۸۸۹ء میں رامپور میں انتقال ہوا۔ اور باغ مہدی علی خاں میں دفن ہوا

ننھے خاں معشوق ساز [۳۷]

(حسب بیان فدا علی خاں) ننھے خاں کا وطن رامپور تھا۔ سرکاری ملازم تھا۔ معشوق سازی میں مشہور تھا۔ عہد نواب جنت مکاں میں یعنی ۱۹۲۹ء تک زندہ تھا۔ بعد کو بمبئی میں انتقال کر گیا۔

مراد علی خاں لکھنوی [۳۸]

صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وطن لکھنؤ تھا اور موسیقی میں ماہر تھا۔

علی جان نچنیا [۳۹]

(حسب بیان بشیر الدین خاں عرف چھٹن خاں) علی جان کا قدیمی وطن رامپور تھا۔ بگا جان نامی ہیرالن کا شوہر تھا۔ گاتا بھی تھا اور ناچتا بھی تھا۔ نادری مظفر کے بھتیجے کے پاس رہتا تھا۔ ۵۰ سال کی عمر میں نواب کلب علی خاں کے انتقال سے ۹-۱۰ سال پہلے ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں کسی کے دھوکے میں قتل ہوا۔ اور تکیہ شاہ شیخ کے قبرستان میں دفن ہوا۔

طوائفیں

داروغہ محبوب جان

(حسب بیان سید ابن علی صاحب مصاحب افسر ارباب نشاط)
نواب سید یوسف علی خاں کے عہد کی طوائف تھی۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں اعزاز میں کافی اضافہ ہوا۔ مزاج میں بہت دخیل تھی۔ بے نظیر کے میلے میں ہمیشہ سرکار کے ساتھ رہتی تھی۔ خلد آشیاں کے ہمرکاب حج کو بھی گئی تھی۔ شہرت (جیسا کہ بتاتے ہیں) بہت مشہور تھی۔ ناچتی بھی اچھا تھی۔ انتقال خلد آشیاں کے انتقال سے تین چار سال بعد یعنی ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان رامپور میں ہوا۔ داروغہ محبوب جان نے حبیب شاہ میاں کے مزار کے قریب ایک نہایت وسیع و شاندار مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور حجرہ شریف کے لیے ایک وسیع پختہ مکان بھی تعمیر کرا کر وقف کر دیا تھا۔ جو اب بھی اسی حالت میں موجود ہے۔

عزت بخش طوائف

عزت بخش طوائف کا وطن لکھنؤ تھا۔ بعہد خلد آشیاں ملازم تھی۔ مجرائی تھی۔ گانا اچھا تھی۔ نواب جنت مکاں کے ابتدائی عہد ۱۸۹۵ء یا

ئام میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

۴۳ نورشن کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

چنّو ۴۴

(حسب بیان حشمت جان طوائف) چنّو طوائف ممّی کی بڑی بہن تھی اور
ستاگو تیجے کی بیٹی تھی۔ سرکاری ملازم تھی۔ انتقال رامپور میں ہوا اور شاہ
بغدادی صاحبؒ کے احاطہ مزار میں دفن ہوئی۔

اللہ رکھی ۴۵

منشی بشیر الدین خاں اور پسر اللہ رکھی غلام حسین خاں سے معلوم ہوا کہ اللہ رکھی کا
وطن رامپور تھا۔ اللہ رکھی سرکاری ملازم تھی۔ اور "مرغی والی" کے نام سے مشہور تھی۔ اسکی وجہ
صبیر رامپوری یہ بیان کرتے ہیں کہ مرغیاں زیادہ پالنے کی وجہ سے اس نام سے
مشہور ہوئی۔ لیکن بشیر الدین خاں یہ بتاتے ہیں کہ اللہ رکھی کو مرغی کا گیت
یاد تھا جس کو اکثر لوگ بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ اور یہی وجہ اس نام سے
شہرت کی ہوئی۔ حلیہ بقول بشیر الدین خاں یہ تھا۔ چھریرا بدن۔ قد میانہ۔ رنگ
گندم گوں۔ کتاب روجہر بذریعہ ملا ظریف میں ملتی تھی۔ بعد کو نیے میاں
تھانیدار سے نکاح کر لیا تھا۔ انتقال رامپور میں بعمر ۵۰ سال سنہ ۱۹۲۰ء میں

ہوا۔ محلہ آلی عصمت خاں کے قبرستان میں دفن ہوئی۔

نئی کلکتہ والی ۱۴۳

نئی کلکتہ والی کے متعلق تحقیق سے صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ یہ کلکتہ کی طوائف سرکاری ملازم نہ تھی۔ بلکہ بے نظیر کے میلے میں ناچنے گانے کو آیا کرتی تھی۔ اور اسی طرح کثیر طوائفیں آتی تھیں۔ اور رقص کرکے چلی جایا کرتی تھیں۔ اس لئے حالات کی اطلاع نہ ہوسکی۔

عباسی ۱۴۴

منشی بشیر الدین خاں سے معلوم ہوا کہ عباسی طوائف باشندہ رامپور تھی سرکاری تنخواہ دار تھی۔ [illegible] یہ ملا ظریف سے بیاہی تھی۔ [illegible] کے آخر عہد میں ۷۰ سال کی عمر میں رامپور میں انتقال ہوا۔ محلہ آلی عصمت خاں کے قبرستان میں دفن ہوئی۔

عزیزن ۱۴۵

منشی محمد اسمٰعیل خاں متخلص بہ تجمل سے معلوم ہوا کہ عزیزن طوائف کا وطن رامپور تھا۔ گاتی بھی تھی اور ناچتی بھی تھی۔ ۳۳ سال کی عمر میں بمرض طاعون سنہ ۱۹۰۲ء [illegible]

۱۹۰۳ء میں رامپور میں انتقال کرگئی۔ اور راجوں کے تکیے کے قبرستان میں دفن ہوئی

ہنگن جان ۴۹

(حسب بیان سید ابن علی صاحب منصاحب) ہنگن جان طوائف کا وطن لکھنؤ تھا۔ گانے میں مشہور تھی۔ خلد آشیاں کے عہد میں سرکاری ملازم تھی خلد آشیاں کے انتقال کے بعد صاحبزادہ سید حیدر علی خاں کی ملازم ہو کر منفا بلسی چلی گئی تھی اور وہیں انتقال کیا۔

بندی جان ۵۰

سید ابن علی صاحب منصاحب سے معلوم ہوا کہ بندی جان کا وطن رامپور تھا۔ سرکاری مجرائی تھی۔ انتقال رامپور میں خلد آشیاں کے انتقال کے دو چار سال بعد بعہد کونسل آف ریجینسی ہوا۔

کنیزیں

چھمیا[۵۱] اور رحیمی[۵۲] دونوں خواصیں تھیں۔ رامپور کی رہنے والی تھیں۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہوسکے۔

جان صاحب کی شاعری پر ایک نظر

جان صاحب ریختی گو شاعر تھے۔ ان سے پہلے کئی چند ریختی گو شاعر گزر چکے ہیں۔ جن میں سے سعادت یار خاں رنگین کا درجہ اتنا بلند ہے کہ انشا وغیرہ نے انھیں کو اس صنف کا موجد قرار دیا ہے۔ رنگین کے بعد خود سید انشا کا درجہ ہے۔ لیکن اس وقت تک ریختی میں اشعار کے ذریعہ اظہارِ خیالات کو صرف مزاح اور خوش طبعی کا ایک آلہ تصور کیا گیا تھا اور مضامین کے ابتذال، عریانی اور پست مذاقی نے اس صنف کو اس درجہ بدنام کر دیا تھا کہ کوئی سنجیدہ اور ثقہ شخص اس کا سننا تو درکنار نام لینا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔

جان صاحب نے شاعری کی کامل صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے اس بدنام صنفِ سخن کو کیوں اختیار کیا۔ مجھے اس کے واقعی اسباب کا علم نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ جان صاحب کی ندرت پسند اور آزاد طبیعت نے شاعری کی عام شاہراہ سے اس لیے گریز کیا ہو کہ دیگر اصنافِ سخن میں باکمال شاعروں کی بہتات کی وجہ سے انھیں امتیازی درجہ حاصل کرنے میں دشواری محسوس ہوئی۔ یا اسی بدنام صنفِ سخن میں اصلاح و ترقی کی ضرورت کے احساس نے انھیں مجبور کر دیا ہو کہ اسے عیوب سے پاک کر کے اوجِ کمال پر پہنچا دیں۔ تاکہ ان کے استادانہ کمال کے جوہر بروئے کار آ کر انھیں اس

صنفِ سخن کا مصلح اور خاتم تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شاعر اپنے مذاق اور فطری رجحان اور خداداد صلاحیتوں کے تحت کسی نہ کسی صنف کو شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے منتخب کر لیتا ہے چونکہ جان صاحب عورتوں کے مخصوص محاورات اور ان کے فطری رموز اور جذبات سے پوری طرح واقف تھے جن کے اظہار کے لئے صرف یہی ایک صنفِ سخن موزوں ہو سکتی تھی اس لئے انھیں مجبوراً اس صنف کے اختیار کرنے کے سوائے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا ہو۔ بہر حال اس کے اسباب کچھ بھی ہوں انھوں نے جو قدم اٹھایا وہ نتیجہ کے اعتبار سے نہایت کامیاب ثابت ہوا اور وہ اس صنف کے تنگ میدان میں سے ایک نیا راستہ نکال کر اپنے ارادے میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ انہی کی بدولت ایک صنفِ سخن کا دامن بدنامی کے داغوں سے ایک حد تک پاک ہو گیا۔

دنیا جانتی ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ مذاقِ سخن بھی بدلتا رہتا ہے نظیر اکبر آبادی کی وہ نظمیں جو مبتذل کہلائی جاتی تھیں اور جن کی وجہ سے ان کا مرتبہ شاعری پست مانا جاتا تھا آج زمانے کے معیارِ پسند اور ذوقِ ادب کے تغیر کی وجہ سے وہی مبتذل نظمیں شاعر کی شہرت کمال کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ یہی صورتِ حال جان صاحب کی شاعری کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ اب لوگ اسے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں اور ان کی شاعری میں عقائد

مذہب، اخلاق، نصائح، معاملات، خودداری، اصلاح رسم و رواج، سماجی زندگی
وطن پرستی، مشرقیت اولوالعزمی کے علاوہ اوہام پرستی کی جو بڑی اصلاح مذمت پائی
جاتی ہے اسکے معترف ہو چکے ہیں۔ واقعی یہ ہے کہ اس پست اور بدنام صنف میں
انھوں نے ایسا کمال کر دکھایا کہ ریختی کی غلاظت سے مضامین کے بار رسوائی چمکتا اٹھے
اور عیب ہنر سے تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے زیادہ تر غزلیں لکھی ہیں جن میں ہر قسم کے
اصلاحی پہلو کو ادا کیا ہے۔ اور غزل میں مرد و عورت کے تخاطب کا نزاع کلیتہً ختم کر دیا ہے

شاعرانہ نقطۂ نظر سے ان کے کلام کی خصوصیات بھی امتیازی درجہ
رکھتی ہیں۔ ان کا کلام عربی اور فارسی کے الفاظ اور اضافتوں سے بڑی حد تک
پاک ہے۔ کلام میں آمد ہے۔ مبالغے کی جگہ حقائق ہیں۔ سادگی اور بے ساختگی ہے
محاورہ بندی کے تو حاکم ہیں۔ انداز بیان میں ندرت اور دلآویزی ہے۔

جان صاحب کی اس مسدس کی اشاعت سے اہل ادب کو یہ اندازہ
ہوگا کہ انھیں اپنی زبان اور بیان پر کتنی قدرت تھی اور یہ بھی کہ اس صنف میں
ترقی کا کتنا امکان موجود ہے۔ ان عورتوں کی زبان میں جو رنگینی اور انشا کے
بیان گندی باتوں کے بیان تک محدود ہے۔ جان صاحب نے میلے کے ہر پہلو کی
ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے جس سے میلے کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔
پھر کمال یہ کہ میلے کے ہر اہل کمال اور ہر پیشہ ور کا جب ذکر آیا ہے تو اس کی
رعایت سے ایسے مناسب الفاظ اور مصطلحات کا استعمال کیا ہے جس سے

شاید پیشے والا خود بھی باخبر نہ ہو۔ یہ ان کی معلومات اور علمی عظمت کی کھلی دلیل ہے۔ مسدس کے بہت کم ایسے شعر ہوں گے جن میں کسی نہ کسی صنعت کا استعمال نہ ہوا ہو۔ صنعتوں میں مراعات النظیر، تلمیح اور ایہام کی جابجا کثرت ہے اور صنائع کا استعمال اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو بغیر غور کئے صنعت کا پتہ نہیں چلتا۔ نہ تصنع کا شبہ ہوتا ہے اور نہ شعر کی تاثیر میں کوئی فرق آتا ہے۔ مثلاً مسدس کے چند بند ملاحظہ فرمائیے۔

جوہری

اک سمت کو ہے جوہری بازار کا پھیلاؤ　قیمت تو کر رہے ہیں جواہر کی موتی لال
دلال اسکے دو ہیں یہ شرکت کا ہے وبال　ہیرے نیا کہتا ہے کیونکر ہوا نقصان

نتھیا نے اور چنی نے گوہر خریدے ہیں
سرکار کے ہی فیض سے بے زر خریدے ہیں

اس بند میں جوہری بازار کا ذکر ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جواہرات کے سلسلے میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ ذہنی کاوش اور وسعت معلومات کے آئینہ دار ہیں۔ "موتی" کی رعایت سے خریدار کا نام "موتی لال" تجویز کیا گیا۔ جس میں موتی اور لعل دو جواہرات کا بھی ذکر آ گیا اور نام بدستور باقی رہا۔ اسی طرح ہیرا اور پنا بھی جواہرات ہیں لیکن پڑھنے والے کو بھی معلوم ہوتا ہے

"کہ یہ انسانوں کے نام ہیں۔ نیتھیا بھی خواص کا نام ہے لیکن یہ نام بھی "نتھ" کی وجہ سے تجویز ہوا۔ اسی طرح چنی بھی جواہرات کی قسم سے ہے اور خواص کا نام بھی۔ اب آپ غور فرمائیں کہ مختصر سے بند میں کتنی رعائتیں اور مناسبات کس خوبی سے جمع کر دئیے گئے ہیں جن سے اصل مضمون اور کلام کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

گھوسن

خوش ہیں اُبال دودھ کی صورت میں لا رہیں　　اور کھٹے میٹھے بول ہیں یا سنا رہیں
ہیں عشق کو جو حسن کا ضامن بنا رہیں　　بالائی بالا دل ہیں ہیں نقشے جما رہیں
میٹھی زبان دہی سے سوا اپنی بولی ہے
جو بات گھوسنوں کی ہے مکھن کی گولی ہے

اس بند میں دودھ کی رعایت سے ابال اور ابال کی مثال کے لئے دودھ کا استعمال کتنا بہتر استعمال ہے۔ اسی طرح بولوں کے پردے میں کھٹاس اور مٹھاس اور "بالا ہی بالا" کے محاورے میں "بالائی" کی رعائت کتنی خوب ہے۔ سب سے زیادہ قابل تعریف وہ تشبیہ ہے جس کی رو سے گھوسنوں کی بات کو مکھن کی گولی ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی گھوسنوں کی باتیں اتنی دلاویز اور مرغوب ہیں جس طرح کہ مکھن کی گولی انتہائی رغبت کی وجہ سے

منہ میں رکھتے ہی فوراً حلق کے نیچے اتر جاتی ہے۔ اسی طرح گھونگھروں کی بات منہ سے نکلتے ہی کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر سامعہ نواز ہوتی ہے۔ کمال یہی ہے کہ ہر دکاندار کے حالات میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے مضمون اپنی جگہ بدستور قائم رہتا ہے اور دوکان کے سامان کا ذکر بھی ضمنی طور پر اپنی فہرست پیش کر دیتا ہے۔

حلوائی

حلوائیوں کی تھالوں کی کثرت ہے جابجا　　　دوکان اے بی خرما پر لکھ پیڑ سے سوا

حلوائی پوری بات بھلا کرنے پائے کیا　　　اے برفی جان تجھ سے جہاں کا کہے زرا

ایسا نہ ہوگا مصر میں بازار اد ہی گرم

مصری نبات پوچھ کہ آتی ہے مجھکو شرم

اس بند میں مٹھائی کے تلازمات قابل ملاحظہ ہیں۔ "بی خرما" فرضی مخاطب میں لفظ "خرما" کا موزوں استعمال پھر "پیڑے" کا لفظ اسکی وجہ سے "لکھ پیڑے" کی تلاش یقیناً قابلِ داد ہے۔ "لکھ پیڑے" کا اطلاق اس باغ پر ہوتا ہے جس میں لاکھ پیڑ ہوں۔ مراد کثرت سے ہے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ اس موقع پر اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کیا ہو سکتا ہے جو مضمون کی رعایت سے خالی بھی نہ ہو اور بامحاورہ بھی ہو۔ اسی طرح

"پوری" کو بات پوری ہونے سے پہلے ہی ظاہر کرنا "ہرنی" یا ان فرضی مخاطب سے "ہرنی" کی طرف اشارہ کرنا، نہایت یعنی مسہری کا ذکر "نہ باتا بوجھ" کے پردے میں لانا یہ سب ان کی قدرت، مشق اور تلاش کا حاصل کے اونیٰ نمونے کہے جا سکتے ہیں۔

یہ تو بہت آسان تھا کہ وہ ہر پہیلی در اور ہر چیز کا تذکرہ کرتے۔ یا ان کا ذکر نظم میں صاف طور سے کر دیتے لیکن اس میں کوئی لطف نہیں آتا۔ شاعرانہ کمال یہی ہے کہ مضمون میں کسی قسم کا خلل نہ آنے کے باوجود تمام مناسبات کا ذکر آ جائے۔ اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات پیدا ہو۔

کھنگنیں

آئیں بکھر بکھر کے محلوں سے کھنگنیں — جو روکتا ہے کہتی ہیں ہٹ ٹوکرے چلیں
پنجوں کے بل ہیں چلتی دکھا کر نزاکتیں — ستھری ہیں جھاڑو ناز سے عمر نے کہو لیا کر

جو ٹھورا ان کا پیارا کوئی آنے جانے پر
کوتگا کی قسمیں کھانے لگیں وہ کمانے پر

کھنگنوں کی مناسبات اور لفظی رعایتوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

"ہٹ ٹوکرے" ڈانٹ کا ایک جملہ ہے لیکن شاعر کو صرف "ٹوکرے" کے لفظ سے غرض تھی جو پوری ہو گئی۔ اسی طرح کھنگنوں کا تعلق "جھاڑو" اور

"پنچھے" سے بھی ہوتا ہے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ "پنچھے" کو پنچوں کے بل چلنے کے محاورے میں کس خوبی سے ادا کیا گیا اور جھاڑو کے ساتھ ستھری کا استعمال کس خوبی سے کیا گیا۔ اسی طرح "گھورا" اور "گوڑا" اور "کمانا (کم آنا)" یہ تینوں الفاظ نہایت مکروہ اور گھناؤنے تھے۔ لیکن اشعار میں ان کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ قابلِ داد اور شاعر کے کمال کی ادنیٰ دلیل ہے۔

شعرا

مشہور شاعروں میں ہیں منشی میاں نظیر ۔۔۔ استاد جن کے منشی مظفر علی اسیر
شاعر جلال اور زکی دونوں بے نظیر ۔۔۔ یہ چاروں آفتاب ہیں چاروں منیر
سرکار اس رباعی کی توقیر کرتے ہیں
قطعے۔ قصیدے روز یہ تحریر کرتے ہیں

اس بند میں فنِ شعر کے مناسبات ادا ہونے کے علاوہ "بے نظیر" اور "منیر" یعنی "بدرِ منیر" کا ذکر بھی آ گیا اور چاروں شاعروں کو رباعی سے تعبیر کرنا فنی مناسبت کے اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔

مسدس کے مخاطب

مریم نسا۔ بوا۔ سبزہ۔ بیگما۔ چمپا۔ فہیم النسا۔ بنی جان۔ مصری۔ بی حسنا۔ ننو۔ باجی اماں۔

مسدس کا سال تصنیف

مسدس کے اشعار اس کے سال تصنیف کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں اور دوسرے ذرائع تحقیق بھی جواب دے چکے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ سال تصنیف کے تعین کے لئے قیاس کا سہارا لیا جائے اور واقعات کی پوری چھان بین کے بعد اگر ہم یقینی طور پر اس کا سال تصنیف معین نہ کرسکیں تو کم سے کم ایک ایسی مدت کا تعین ہو جائے جس کے دوران اس تصنیف کا عالم وجود میں آنا قطعی طور پر قرین عقل و قیاس ہو۔

حسن اتفاق کہ مسدس پر بار بار نظر ڈالنے سے امید کی کرن چمکی اور مسدس کا بند ۹۶ راہنما ثابت ہوا۔ اس بند میں اس وقت کے جن موجودہ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں زکی بھی شامل ہیں۔ زکی کے انتقال کے بارے میں امیر مینائی انتخاب یادگار میں تحریر کرتے ہیں کہ "میر زکی ریاست میں برسوں ملازم رہے۔ پھر حیدرآباد دکن کو گئے اور وہاں کئی برس مقیم رہے۔ پھر وہاں سے رخصت لیکر وطن پہنچے۔ اور وطن ہی میں شعبان کی بارھویں تاریخ ۱۲۸۸ھ میں بعمر پچاس سال انتقال ہوگیا۔"
(۱۸۷۱)

اس بیان کے مطابق اگر کئی برس سے تین سال جو جمع کا ادنیٰ عدد ہے مراد لیے جائیں اور پھر زمانہ رخصت و علالت وغیرہ کو بھی شامل کیا جاسکے

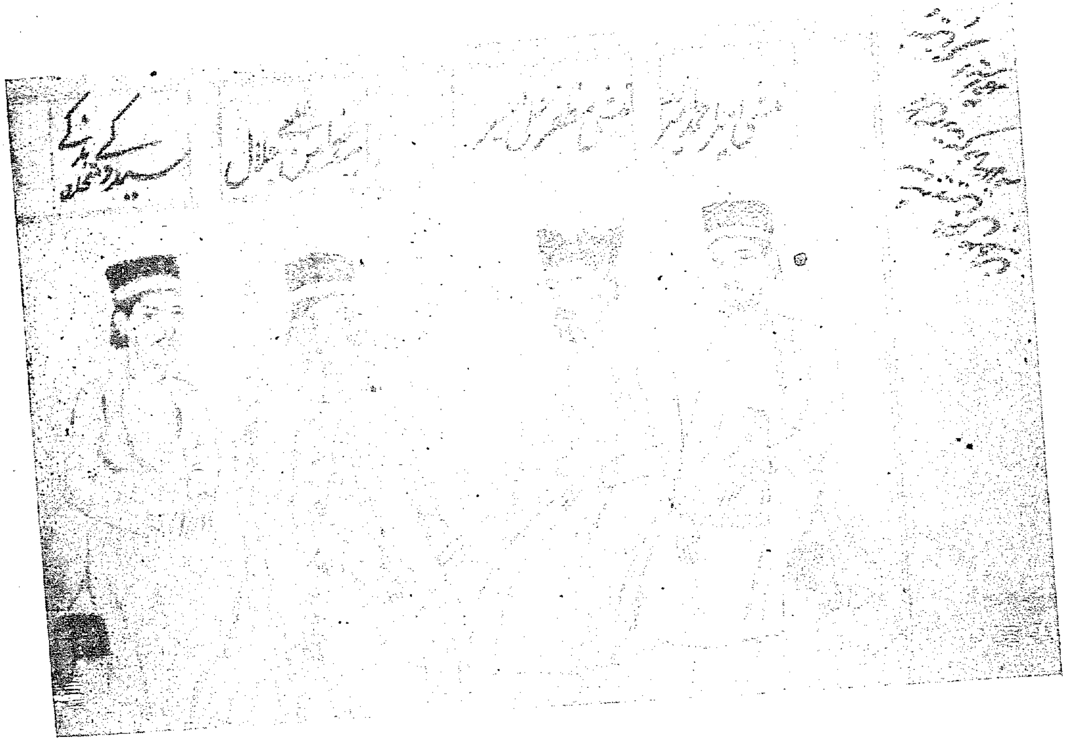
تو کم سے کم تین ورنہ چار سال کا زمانہ ۱۸۷۱ء سے کم ہونے پر سالِ تصنیف ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ جب اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ سب سے پہلا میلہ ۱۸۶۶ء میں ہوا اور یہ تقریباً ناممکن تھا کہ جب تک پہلے میلے کے مفصل حالات نہ دیکھے جاتے ایسی اہم ترین مسدس جس کی ترتیب میں ہر موقع کی تصویر کشی کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ میلے کے چند دنوں میں مرتب کر لی جاتی، لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ مسدس ۱۸۶۷ء کے میلے میں جو دوسرا میلہ تھا مرتب کر کے پیش کی گئی۔ اس کی تائید مسدس کے پہلے نمبر سے بھی ہوتی ہے جس کا پہلا مصرع ہے۔

"پھر اگلے سال سا وہی شہرہ ہے جشن کا"

مسدس کی سند

اس بات کے ثبوت میں کہ یہ مسدس وہی ہے جو خلد آشیاں کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔ ہم نے بند ۸۸ کا عکس شامل کر دیا ہے جس کے حاشیے پر امیر مینائی کا نوٹ خود اُن کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ جو ثبوت کے لئے کافی ہے۔



مسدس تہنیت جشن بے نظیر

میر یار علی جان صاحب

مسدس در تہنیت جشن جناب مستطاب معلی القاب نواب صاحب

کلب علی خاں حاتم دوراں و سکندر مکیباں حضور پر نور والی رامپور دام اقبالہم

پھر اگلے سال سا وہی شہرا ہے جشن کا (۱) پھر دیکھو وہی دھوم دھڑکا ہے جشن کا
بدر منیر پھر لوا میلا ہے جشن کا پھر بے نظیر باغ میں جلسا ہے جشن کا

پھر چہچہے وہی ہیں ہر اک دل ہزار ہے
پھولا ہے گل خوشی کا عجب پھر بہار ہے

ہے ان دنوں سوا در دولت پہ اژدہام (۲) تھا حکم کرتے ہیں جو آن بر آتے ہیں کام
قابل ہے جس کے جو تھی ہوا ہے اسی کا نام تیار ہوتے جشن کے سامان ہیں تمام

کمپوں میں انتظام کی ایک اور دھوم ہے
کاریگری کے ذکر میں ہر جا ہجوم ہے

انگریزی اور ولایتی کشمیری نام ور (۳) سب اپنے اپنے آج ہیں کھلاتے ہیں ہنر
سرکار سے ہیں پاتے ہیں پھر بڑے جوڑے ہیں روز دیکھتی ہوں کس کو ہے کیا خبر

اقلیم ساتوں ڈھونڈے نہ کوئی کہیں ملے
استاد لاجواب ملے تو یہیں ملے۔

لہ اصل اثر دہام۔

استادرنڈی مردوے[1] سارے جہان کے (۴) قلّاش ہے جو ملائیں زمین آسمان کے
حاضر ہوئے حضور میں شہروں سے آن کے مشہور اپنے فن میں ہیں بالا[2] نشان کے
صنعت پہ جن کی یہ در و دولت گواہ ہے
دیوان خانہ کہہ رہا خود واہ واہ ہے

دیوان خانے میں جو ہے کوٹھی نئی نئی (۵) مریم نسا ہے نام خدا خوب ہی بنی
کھانے ہیں اس میں لاٹ بہادر کی حاضری دونوں طرف چمن میں ہیں تصویریں انگریزی
اے صاحبو جو دیکھنے انگریز آتے ہیں "
لندن کے باغ کوٹھیوں کو بھول جاتے ہیں

ہے جشن جس کا نام وہ خود شاد جشن ہے (۶) مرغوب ہے خدا کو خدا داد جشن ہے
دکھلا رہا عجیب یہ ایجاد جشن ہے آبادی جن کے قدموں سے آباد جشن ہے
اللہ رکھے ان کو سلامت جہان میں
اس جشن کی خوشی ہے زمین آسمان میں

برلائے وہ خدا جو ابھی دل میں موج ہو (۷) حشمت[3] زیادہ ان کا سلیمان سے اوج ہو
قبضے میں سونے کے ظفر موج فوج ہو اور ان کا بیری جو ہو وہ سر بہ نوج[4] ہو
یہ نوجوان رئیس ریاست کے حسن ہیں
جن کی ہیں شان یہ شوکت کے حسن ہیں

---

[1] اصل: مردوہ [2] بلند مرتبہ۔ [3] دعائیہ کلمہ "خدا ایسا ہی کرے" [4] زنانہ محاورہ "ایسا نہ ہو"

شاعر خوش بیاں غزل گو قصیدہ خواں (۸) خیمہ لگا رہے اپنے بھی کرتے ہیں بیاں
کیا لکھیں پڑھ کے کیا کہیں کیا نتیجہ نہیں یہاں   اس جشن کے تو وصف میں قاصر ہے اب زباں

جلسا وہ دیکھا جشن کا جیسا اس میں دیکھ لو
آئینہ یہ ہے سر بگریباں ہیں دیکھ لو

شاہوں کے بھی جو ہوگا نہ آیا نظر میں (۹) سامان عیش کا ہے وہ حاضر حضور میں
اس روشنی کا جلوہ تو ملتا ہے طور میں   قدرت خدا کی آئی نظر رام پور میں

موسیٰ کی یہ زبان سے ہیں نغمے ہزار کے
گلزار جشن کیوں نہ ہو دن ہیں بہار کے

نواب نامدار کے جلوس کا (۱۰) سر جشن سے زیادہ ہے شوکت کا مرتبہ
جمشید بھی تگور کا کیا جشن مال تھا   قربان ایڑی جوتی پہ اس کو کروں ہوا

اسباب جشن کا ہے جو لوگو جناب میں
جمشید نے تو دیکھا نہ ہوگا یہ خواب میں

پوشاک فاخرہ وہ رفیقوں کے بدن میں ہے (۱۱) جامہ ہے جو حریر سے بہتر نظر میں ہے
ایک اک گھڑی بھی سونے کی اک اک کمر میں ہے   زریں کمر غلام ہر اک غرق زر میں ہے

سرکار کی عیاں ہے یہ دریا دلی کا فیض
حاتم تو کیا نہ ہوگا مقابل کسی کا فیض

ا؎ اصل : ۔ جامہ ہے جو حریر سے بہتر ہے

کوسیؔ[۱] سے کوسوں تک یہی ہوتا ہے اٹکا (۱۲) پیدل ہیں جابجا کہیں اترے ہوئے سوار
تنبو سراچے، بارگیاں[۲] خیمے بے شمار بکھرے تنا میانے کٹہرے میں کئی ہزار
اور چھپر راوٹیوں کی بھی احاطہ قناتیں ہیں
کیا خوب دن ہیں جشن کے کیا خوب راتیں ہیں

غنچے ہیں بیٹیوں کے ہیں گلدستے مرد ہے (۱۳) پھولے نہیں سماتے ہیں سب دیکھ دیکھ کے
سو رنگ سے حنا کی روش ڈال ہی لیا ہے اور شوخ شوخیوں میں ہیں شاخیں نکالیے
نظارہ باز حسن کا ایک اک نہال ہے
اے سبزہ پھل مراد کا ہر خوش جمال ہے

دینے جو نذر جشن کی اے جیا جاؤنگی (۱۴) مالن بنوں گی پھولوں کی ڈالی لگاؤنگی
پھولا شگوفہ عیش کا سو رنگ لاؤں گی گل شرفی[۴] کے ڈھیر کے ان لپاؤں گی
دوں گی دعا بہار یہ پھولیں پھلیں حضور
دن رات جشن چین سے جھم جھم کریں حضور

کیوڑے کے پھول سے بھی کہنا گلاب ہے (۱۵) سچ ہے قول کینکی[۵] کا لاجواب ہے
یوسف لقا ہیں یہ عالی جناب ہے زیبا ہیں سو امنگیں غلو پہ شباب ہے
نواب نامدار بہادر رئیس کا
نام خدا ہے سن ابھی انتیس تیس کا

---

۱ رامپور کے دریا کا نام - ۲ عظیم الشان خیمے - ۳ عورتیں ۴ زرد رنگ کا پھول ۵ پھول کا نام

ہر غنچے کی چٹک سے یہ بولی کلی کلی (۱۶) یہ شہر ہیں محمدی اللہ کے ولی
تیرے محب ہیں نام سے ثابت ہے یا علی   ما دل رئیس کلب علی خاں مہابلی

نوروز سے زیادہ ہمیں آج عید ہے
ہر ماہ سے یہ ماہ مبارک سعید ہے

نوروز ہولی کیجیے اس جشن پر نثار (۱۷) سے بھرے ہیں رنگوں کی مشکیں کئی ہزار
خوشبو سے ہیں نہلاتے ہر اک کو لالہ زار   کوثر تو حوض رنگ میں جنت کی ہے بہار

میلے کا طور[۱] طرفہ ہے بس اپنے ڈھنگ پر
تصویریں زندی مردوں کی ہیں ایک رنگ پر

بلبل ترانہ سنج سراسر چمن چمن (۱۸) اور خوش نوا ہیں ہوتے سب گھر چمن چمن
دل باغ باغ باغ میں ہے ہر چمن چمن   غنچے لئے ہیں مٹھیوں میں زر چمن چمن

سنبل کی چھپ گیا ساری پریشانی دور ہے
لالہ کے دل میں داغ کی جا دیکھو نور ہے

ہر گل کی بیکلی گئی ہنسا ہے کہہ رہا (۱۹) چھٹیا چنبیلی اور مدن بان سوگرا
سب کھل کھلا کے ہنستے ہیں کہتا ہے موتیا   سوسن کی یہ زبان ہے نرگس ہے دیکھنا

کس درجہ یہ بہار یہ جلسا ہے جشن کا
جوبن نیا ہے طور نرالا ہے جشن کا

۱؎ اصل: تور

کیونکر نہ بن کے آتے ہیں باغ میں بہار (۲۰) داماد کا بیاہ جشن ہے قرباں ہیں نثار
آئی ہے جلد بادِ بہاری ہو ہوشیار بولا گل پیادہ[1] زمین اور گل سوار[2]
گو تاج سے خروس کے سر پر چڑھا رہے
کہدو اسے چمن میں ادب سے کھڑا رہے

گیندوں کے بر میں جوڑے بسنتی زیب و زرد (۲۱) پہنے بہار جوڑا ہے نارنجی[3] کا طرفہ فرد
سبزہ ہے لہلہا با پہلی ہوا ہے سرد شبنم ہے آبپاشی کی خاطر اڑے نہ گرد
جامے گلوں کے بر میں ہیں لاکھوں ہی رنگ کے
نوشہ ہے طرفہ جشن براتی ہیں ڈھنگ کے

کہتا ہے عشق پیچا سہاگن ہے بار بار (۲۲) ہم جشن کے ہیں جشن ہمارے گلے کا ہار
باعث ہے جشن کے جو ہے سرسبز مرغزار سرکار کے قدم سے ملا اسکو افتخار
گلزار خط میں نظم بہار یہ چاہیے
مضموں کا رنگ لکھنے میں کچھ کچھ نیا چاہیے

گل ہیں یہ ہیں آج فلک تک دماغ ہیں (۲۳) کہتی صبا ہے باغ میں سب باغ باغ ہیں
تابندہ اپنے حسن سے لالہ کے داغ ہیں دن رات کے چمن میں کلی کے چراغ ہیں
کہتا ہے آفتاب یہ گل ماہتاب[4] سے
یہ باغ سینچا جاتا ہے کیوڑے گلاب سے

---

[1] ڈالی سے ٹوٹا ہوا پھول۔ [2] ڈال میں لگا ہوا پھول۔ [3] دلہا یا دلہن کی شادی کے زرد رنگ کا جوڑا [4] چاندنی کا پھول

راحت کے کوتوال کا ہر جا ہے بندوبست[1] (۲۴) ہے اپنے اپنے رنگ میں ہر زن و مرد مست
بالا ہے چرخ لاکھ زمیں گو ہے زیر دست رتبہ میں آسمان نہیں اس سے آج پست
افشاں اڑی ہے ایسی زمین آسمان ہے
ذروں پہ دیکھو تاروں کا ہوتا گمان ہے

دکھلا رہی ہے رنگ یہ کیسی عجب بہار (۲۵) میلا تو ور دیول سے ہے گلزار آشکا
زیور کہیں کھلے نگیں ہیں رنگیں سنتر سوار کرسی بچھا کے بیٹھے ہیں مل کر کے صدر دار
غش ہو رہے تلنگے[2] ہیں گاتی ہیں ٹٹنیاں
ڈھولک پہ کیا کیا بھاؤ بتاتی ہیں رنڈیاں

حلوائیوں کی پالوں[3] کی کثرت سے ہے بچا (۲۶) دوکان اسے فی خطاری لکھ پیڑ[4] سے سوا
حلوائی پوری بات کمال کرنے پا گیا اے برفی جان ہو دل جان تک بہرا لہا
ایسا نہ ہوگا مصر کا بازار بھی گرم
مصری نبات[5] پوچھ کر آتی ہے مجھکو شرم

---

۱ چاندی سونے کے ذرے جس سے پیشانی اور زلفوں کا سنگھار کرتے ہیں۔
۲ "تلنگے"۔ بمعنے سپاہی۔ ۳ کنجر چھپر کی طرح سے سرکیوں کا پال بنا کر بیٹھتے ہیں۔ دھوپ اور بوندیوں سے بچنے کے لیے پال ڈال کے حلوائی وغیرہ اپنی دکانیں سجاتے ہیں اس کے نیچے لگا رہا
۴ لکھ پیڑا:۔ وہ باغ جس میں لاکھ پیڑ ہوں مقصود کثرت سے ہے۔
۵ نبات:۔ دراصل "نہ بات" ہے لیکن نون ملا کر لکھنے سے "نبات" بمعنے مصری ایک صنعت بھی پیدا ہوگئی۔

شیریں یا د اٹھا ئی کہیں لیتے ہیں کھڑے (۲۷) فرہاد[1] اڑ مرچڑے[2] عاشق بھی ہیں اڑے
گپ چپ ہیں پڑے نشہ کے آنکھوں میں ہیں بھرے   لڈو کی طرح سیکڑوں ہیں چھوٹے اور بڑے
تل رکھنے کی جگہ نہیں ہر سو پکار ہے
ریوڑی سکے گویا پھیری میں دوکاندار ہے

جہاں ہے بھنی لاکھوں کی زر لاکھ کھوتے ہیں (۲۸) الفت کے بیچ ساقنوں کے دل میں تو ہیں
ہنستے ہیں آج وہ بھی سدا کے جو روتے ہیں   دم مارتے ہیں نشے دھوں دھا ہوتے ہیں
ایک ایک سبزہ رنگ سے گاڑی[3] ہے چھن رہی
ساقن پلاتی برف سے بجلی سی بن رہی

ساقن یہ بولی سوتے سے رکھوں گی گھونٹ کے[4] (۲۹) ہم‌نیا[5] مر نہیں قابل ہے چوٹ کے
اپنے ہو یہ اڑاؤں گی بھاگے گا لوٹ کے   پڑے کی بات ہے نہ سخن ہیچ ادب کے
نشے ہرن میں لکھنؤ کے کرکے آئی ہوں
خاطر میں مرد وں کو میں کس کو لائی ہوں

---

[1] اصل فرہاد وا۔ [2] مرچڑے: ایک قسم کے فقیر جو مزار ہے جن کرکے بغیر کچھ لئے نہیں ٹلتے
[3] گاڑی چھننا محاورہ ہے۔ یا ہم مخلوط کا لیاں دینا۔
[4] اگرچہ صحیح لفظ گھونٹنا ہے لیکن مسدس میں بغیر نون ہی کے لکھا ہے اس لئے وہی نقل کیا گیا
[5] ہم نیت۔ ہمراز

ساقن ان آباد کی ہوں اے امیرو ہیں (۳۰) بیٹھا ہوں میری قدر ہوئی ہے حضور ہیں
ادون کا بوں سے ہے حسن ہمارے ظہور میں   جیسے شب فرق ناریں اے لوگو نور ہیں

ہر سال مجھ پہ کرتے عنایت رہیں سدا
نواب نامدار سلامت رہیں سدا

ہم ساقنوں کی سیر کیوں سے عجیب (۳۱) سلطانی سرخ جیسے مرگ بھٹی کے ہیں قریب
خفے بھی سونے چاندی کے ہم کو ہیں نصیب   حقے ہیں بس رئیس کے پی جاتے ہیں غریب

دو اشرفی کی ایک چلم ہم پلاتے ہیں
سب چھوٹے اور بڑے یہاں پینے کو آتے ہیں

کیا خوب سناروں نے دکانوں کو سجا (۳۲) بٹنو[1] پہ چاندی سونے کے زیور ہزار ہا
چوکی کا ڈر ہے جہ دیتے شوق سے لگا   ڈھیروں روپے اشرفیاں رکھی ہیں جا بجا

حاضر ہے کوڑی پیسا اٹھانے کے واسطے
آؤ بچاتے ہیں بہلانے کے واسطے

اک سمت کو ہے جوہری بازار کا چال (۳۳) قیمت تو کرتے ہیں جواہر کی موتی لال
دلال اس کے دیتے ہیں شرکت کا ہے ڈال   ہیرے بتا کہتا ہے کیونکر ہو نقصال

---

[1] وہ چیز جس میں کوئی شے لپیٹی جائے۔ جیسے بستہ۔ اسے بستہ اور بستی بھی کہتے ہیں۔ یہ دکاندار خصوصاً زرگر اپنی گدی کے سامنے کوئی چیز بچھا کر اس پر کانٹا باٹ وغیرہ نیز زیورات باقاعدہ چن دیتے ہیں اور دوال میں اس بچھونے کی پوجا بھی کرتے ہیں۔

نمقبا نے اور جینی نے گوہر خریدے ہیں
سرکار کے ہی فیض سے بے زر خریدے ہیں
بزازوں نے وہ فرش دکانوں پہ ہیں کیے (۳۴) اطلس کا آسماں بھی شرمائے دیکھ کے
کمخوابوں کے مشجروں کے تھان ہیں بچھے   لپٹے ہیں کھول کھول کے زربفت کے دھرے
ہر بیچنے والا کہتا ہے نزدیک دور کا
تھانوں سے کامدانی کے عالم ہے نور کا
اوقات ہر بساطی[1] کی جتنی بساط ہے (۳۵) گھر میں نہیں رکھی ہے[2] دکانوں پہ سب ٹھٹے
بے دام مول لے رہا ہے نہیں کرنا مول طے   یہ بھی نہیں ہے پوچھتا یہ لیجیے گا کے
سرکار نامدار سے وہ دام پائے گا ۔
دوکاندار جنس نہ کیوں کر لٹائے گا
حاصل ہے سیر مفت کی میلے کا ہے خیال (۳۶) کرتے ہیں جو تماشے وہ کرتے نہیں سوال
ہو ہو کے خوش دکھاتا ہے اپنا ہر اک کمال   سرکار قدرداں ہیں ہو جائیں گے نہال
گردوں ہے دنگ شعبدے ایسے دکھاتے ہیں
چھڑے کی بلّی پر کا کبوتر بناتے ہیں"
ہے جشن بارہ ماسہ کا عالم دکھا رہا (۳۷) جھولے ہنڈولے رنگ کے لگے ہیں جابجا

---

[1] اصل: بساتی ۔ [2] اصل: نہیں ہے رکھی ہے

گویا برس رہا ہے ہزارہ بھی چل رہا   ہیں ہنڈی مرد جھولنے کانٹے میں کچ ملا
پر نہیں پی کب آئیں گے بنا سگن بچار
افشاں ہیں کپڑے رنگ کی ہے پڑ رہی پھوار
ہولی کا میلا گر ہے میلے سے جشن کے (۳۸) کیا کیا ہیں سانگ سانگئے اپنا دکھاتے ہے
گاڑھی ہے چرخ پوجا کی کانٹوں جو پھرے   لاگیں دکھاتے ہیں عجب آن بان سے
کالی کی جے مناتے جو ہر آن ہیں ہوا
عاشق ہیں زلف کے یہ مسلمان ہیں ہوا۔
چھوٹے کہیں ہیں خوانچے والے کہیں بڑے (۳۹) سقے بجا رہے ہیں کٹورے کہیں کھڑے
رسیا جھکے ہوئے ہیں جہاں رس کے ہیں گھڑے   دندان مصری ایسی کہ دانتوں سے جوڑے
جو چیزیں ہیں میلے میں سب لاجواب ہیں
ماہی توے کی سیخوں کے بھنتے کباب ہیں

۱؎ فوارہ ۔ ۲؎ بنا سگن بچار کے معنی ہیں ''بامن انگلوں بکال'' ۳؎ اصل: گاڑھی ہے چرخ پوجا کے کانٹوں پہ پھرے۔ ۴؎ چرخ پوجا = ایک قسم کا تماشا ہے شہتیر زمین میں گاڑ کر ایک رسی اس میں باندھ دیتے ہیں اور لوہے کا ایک کانٹا کسی شخص کی پیٹھ کی ہڈی میں چھید کر اسی رسی میں لٹکا کر گھماتے ہیں۔ اس گھومنے والے کا منھ آسمان کی طرف رہتا ہے۔
۵؎ کالی: بنگالی اہل ہنود کی دیوی کا نام ہے۔ ۶؎ دندان مصری: ایک قسم کی مٹھائی کا نام ہے۔

افیونی جمع ہیں کہ ہیں افیون گھلتی ہے (۴۰) گنے میں چلتے مُرمُروں کی ٹکیا تلتی ہے
ریشم کی طرح نرم زباں اس پہ کھلتی ہے   اپنی تو طبع کھیر کے پیالوں پہ ڈھلتی ہے
افیونیوں سے پوستیوں[1] کا کلام ہے
معشوق یہ مٹھائی عجب لالہ فام ہے
وارفتہ ہم ہیں ایک تو معشوق اپنے دو (۴۱) رنگیں مزاج شیر سے شیریں ہیں دیکھ لو
کیسا ہی تند خو ہو بنا دیں یہ نیک خو   ہر ایک کو ان کے وصل کی کیوں جستجو نہ ہو
افیون اور مٹھائی نہ جو شخص کھائے گا
ہم کو یقین ہے وہ نہیں جنت میں جائے گا
حلوا سوہن وہ جو نری کہیں پڑے پاسا ہا (۴۲) رنگت پہ جس کی دھوکا ہے صابون کا ہُوا
یہ قرص ہے پنیر کا بعضوں نے یہ کہا   پڑا نہ در بہشت[2] پہ بعضوں سے ہو رہا
دوکاندار رکھتے ہیں یہ بے نظیر کے
بھر بھر پیالے ہیں براق کھیر کے
پھولوں کے ہار ہاتھوں کے ہیں گجرے بدھیاں (۴۳) بے دام موں بکتے ہیں انھیں لے کوئی میاں
شوقین مرد ایسے ہیں شوقین رنڈیاں   مالنیں بھی نائنیں بھی کرتی ہیں بیاں

---

[1] پوستی :- وہ شخص جو پوست کا پانی پیئے تاکہ نشہ آجائے۔

[2] "بہشت" مٹھائی کا نام ہے۔

البیلی آؤ لو یہ پلنگ توڑ بیلا[1] ہے
دلّی کے پھول والوں[2] سے بہتر یہ میلا ہے
نیولے سے سانپ کے ہیں سپیرے لڑا رہے (۴۴) اک سمت کو ہیں بیچ قلندر نچا رہے
نٹ اپنا بانس پہ ہیں تماشا دکھا رہے   بندر کو بکری پہ ہیں مداری چڑھا رہے
اک جا پہ ہو رہا یہاں متی کا تماشا ہے
بہروپیا بدل کے نئے روپ آتا ہے

---

[1] پلنگ توڑ بیلے کی صفت ہے جس کی خوشبو نوشاہ و عروس کو ایسا مست کر دے کہ ان کی خوش فعلیوں سے پلنگڑی کے ٹوٹنے کی نوبت آجائے ۔

[2] دلّی کے پھول والوں کے میلے کا مختصر حال یہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی بمقابلہ سراج الدین ظفر پسر بزرگ اپنی بیوی ممتاز محل کے اصرار پر اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے لیکن دلی کے ریذیڈنٹ سٹن صاحب ان کے اطوار سے ناخوش تھے۔ ان کی حرکات سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ مرزا جہانگیر قید ہو کر الٰہ آباد پہنچے۔ ممتاز محل ان کی والدہ نے منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے مزار پر پھولوں کی مسہری چڑھائی جائے گی۔ خدا کی قدرت اور سٹن صاحب کی شرافت کہ انہی کی سفارش سے صاحب عالم قید سے رہا ہوئے۔ جب دلّی آئے تو بادشاہ نے منت چڑھانے کی تیاریاں شروع کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی۔ قطب صاحب میں کئی دن تک میلا رہا۔ پھول والوں نے مسہری تیار کی تو اس میں خوبصورتی کے لئے پھولوں کا ایک پنکھا بھی لٹکا دیا۔ اور اس طرح پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑی جو بڑھتے بڑھتے میلا کچھ کا کچھ ہو گیا۔ (باقی صفحہ ۱۵ پر)

جلسا کسی طرف کو تو ہے تیلی والوں کا (دہم) وہ بانو گجری[۱] گاتے ہیں طبلا بجا بجا
کرتے بھگت میں بھگتیے[۲] لڑکے ہیں خوش ادا　　　پڑھتا غزل ہے تال پہ اک ایک خوش ادا

شہزادے شاہزادی بنی دیو پری یاں ہیں
ہر آن لگے ہیں تانیں بھی تیروں کی سریاں[۳] ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۴۱) بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے جب درگاہ شریف پر پنکھا چڑھا چکتے تو شمسی تالاب میں سیکڑوں کشتیاں اور بجرے ڈالے جاتے، روشنی ہوتی اور ۲ بجے رات تک آتشبازی کے مقابلے ہوتے۔ بادشاہ کی طرف سے انعامات، دوشالے اور خلعتیں تقسیم ہوتیں۔ جلوس کے آخر میں پنکھا ہوتا تھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول ہوتا تھا۔ بادشاہ جلوس کے ساتھ نہیں جاتے تھے۔ چونکہ یہی تمام باتیں بے نظیر کے میلے میں بھی ہوتی تھیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ بے نظیر کے میلے میں بھی نواب خلد آشیاں نے پھول والوں کے میلے ہی کی نقل ہاری کی ہو۔

(ماخوذ از مضمون پھول والوں کی سیر مؤلفہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی)

۱؎ ۔اصل: ۔ وہ بانو گجرے گاتے ہیں طبلا بجا بجا۔ ۲؎ گجری ایک راگنی کا نام ہے۔
۳؎ بھگتیے: ۔ بچوں کو نچا کر تماشا دکھانے والے۔
۴؎ ۔ تیروں کی نوکیں

ہوتے ہیں دل میں ان کے وہ الفت کے تیر پار (۴۴) گانے پہ انکی شکلوں پہ ہر دل ہے جاں نثار
نظارہ باز کہتے ہیں آپس میں بار بار گوشے میں ان کے جلوہ ابرو کماں ہے

دل تو نشانہ ہو چکا یاں سے نہ جائیں گے
یہ جشن سال بھر رہے اب یہ منائیں گے

دھوبی قصائی تھے تو ہیں کہنڈگا[1] رہے (۴۷) اور راجپوت اپنا ہیں آلہا[2] سنا رہے
اک سمت ہیں ڈفالی رباب بجا رہے کنجڑے قصائیوں کو ہیں دیکھی بجھا رہے

سالار[3] اور مدار[4] کی تعریف گاتے ہیں
بالے[5] میاں کے نام پہ بس لوٹے جاتے ہیں

لہ اہل ہنود کا گانا ۔ ٢ رزمیہ نظم جس میں آلہا اور اودل دونوں بھائیوں کی بہادری کے قصے ہیں۔ ٣ ۔ سید سالار مسعود غازی کو جاہل لوگ گاجی (غازی) میاں اور بالے میاں کہتے ہیں۔ آپ ۲۱ رجب ۴۰۵ھ مطابق ۱۰۱۴ء بروز یکشنبہ بمقام اجمیر شریف پیدا ہوئے سلطان محمود غزنوی کے بھانجے یا بھتیجے تھے سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے آپ ملتان ہو کر دلی آئے۔ پھر میرٹھ اور قنوج ہوتے ہوئے ستر کھ بارہ بنکی آئے۔ اور انتہائی شجاعت سے دلی اور راجو دھیا وغیرہ کو فتح کرکے بہرائچ میں مقیم ہو گئے۔ لیکن آپکے رائے لہر اور سہر دیو نے ایک بہت بڑی جمعیت سے حملہ کر کے آپ کو شہید کر ڈالا۔ اس طرح آپ ۱۸ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۴ جون ۱۰۳۳ء کو اتوار کے دن صبح کے وقت شہید ہو گئے آپ کا مزار بہرائچ میں ہے جیٹھ کے مہینے کے پہلے اتوار کو مقبرے پر بڑا میلا لگتا ہے۔ پورب کے اضلاع میں عام طور سے آپ کا میلا ہر سال منایا جاتا ہے۔ مشرقی بنگال میں بھی آپ ہی کے نام سے (باقی صفحہ ۱۷ پر)

بھٹیاریاں کہیں کہیں لڑتے ہیں بھجبڑے (۴۸) پھکّڑ تو ہیں زنانے زنانوں سے لڑتے
اور ان میں کچھ عطائی جگت رنگ مرد ہے ہیں چھلنٹے رموز میں ضلع بھی ہیں [illegible]
ٹھٹھا ہے تماش بینوں کا ٹھٹھے لگاتے ہیں
دیوار قہقہا کا نمونا دکھاتے ہیں

آئیں کھرے کھرے کے محلوں سے بھنگنیں (۴۹) جو روکتا ہے کہتی ہیں مت ٹوک رے [illegible]
ہنجوں کے بل ہیں چلتی دکھا کر بترائیاں ستھری ہیں جھاڑو نارسی عمر نے کیا [illegible]
جو گھورا ان کا یار کوئی آنے جانے پر
گوگا کی قسمیں کھانے لگیں وہ کمانے پر

(بقیہ صفحہ ۱۶) ایک میلا ہوتا ہے۔ چونکہ آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ہر سال شادی کی رسم منائی جاتی ہے۔ (چونکہ عرس کے معنی شادی کے ہیں اس لئے میری رائے میں بالے میاں کے بیاہ سے مراد ان کا عرس ہو سکتا ہے۔) (ماخوذ از تذکرہ غازی مؤلفہ محمد خلیل صاحب)

ؔ مدار صاحب کا نام بدیع الدین ہے۔ مزار مکن پور ضلع کانپور میں ہے اور وہاں ان کا بھی سالانہ میلا ہوتا ہے

ؔ بالے میاں کا ذکر [illegible] میں آچکا

ؔ جگت رنگ: بذلہ سنج و لطیفہ گو

ؔ اصل: [illegible]

ؔ "ٹوکرے" کو "ٹوک رے" لکھنا چاہیے تھا لیکن ملا کر لکھنے میں صنعت کی خوبی سمجھی تا تم [illegible]

خوش ہیں اتال و دھد کی صوت بڑھا رہیں (۵۰) اور کھٹے میٹھے بول ہیں اپنے سنا رہیں
یا عشق کو تو حسن کا ضامن بنا رہیں   بالائی بالا دل میں ہیں نقشے جما رہیں

میٹھی زبان وہی ہے سوا ایسی بولی ہے
جو بات گھونسلوں کی ہے مکھن کی گولی ہے

ہیں کٹنیاں[1] بھی ڈالیاں لائیں ہری بھری (۵۱) باکی داہنیں ایسی ہر اک سبز ہے پری
سیبوں پہ ان کے حسن کی نارنگیاں دھری   کندن سا رنگ حسن میں اک آب ہے کھری

کولے سے باغ میں کھڑی باندھے قطاریں
جوبن دہ ہیں کہ میلے کی گویا بہاریں

ہے جشن اس کا نام یہ ہے کہ یہ بافلک (۵۲) بشاش ہیں امیر سے لے کر غریب تک
میلے میں موتیوں سے دیکھا پھولوں کے ڈھنگ   غلمان حور پریاں فرشتے گئے بھڑک

آئے ہیں راجہ بابو بہت دور دور کے
اس جشن کے نثار ہیں صدقے حضور کے

میلے میں ناچ رنگ کا جلسہ ہے جابجا (۵۳) ٹھٹھے ہیں خاندانی وہ مجرا ہے ہو رہا
زہرہ بھی جس سے مشتری تھرکے لئے ہوا   تیار ہاتھ ڈھاڑیوں کے برق ہے ا

طبلے کی تھاپ جاتی ہے تا آسمان پر
قربان رعد ہوتا ہے ہر ٹھا[2] کی آن پر

---

[1] کٹنیاں : کنجڑ ملوں یعنی ترکاری بیچنے والی عورتوں کو کہتے ہیں ۔ [2] ٹھا ۔ طبلے کے بولوں کو ٹھہر کر نکالنے کو کہتے ہیں

ستک[1] کے بھی حساب سے سُر ہے بڑھا ہوا (۵۴) ہر محبل کرنیوالی کا ہے نور کا گلا
ارگن[2] نثار جس پہ ہو وہ تان کی صدا   قربان ایڑی چوٹی پہ ہو اس کی کوکلا[3]

بلبل ترانہ[4] بھول گئی سُن کے باغ میں
سودا رہا گلوں کا نہ اس کے دماغ میں

ارباب جمع نشاط کے ہیں اس کے لوگ سب (۵۵) حاضر ہیں ہاتھ باندھے ہوئے اک طرف کو سب
سرکار اب ہیں لگے ہوئے ہیں جمع طلب   اک ایک کا لاناگہ ہے اک ایک ہے غضب

دھرپت[5] خیال[6] ٹپے[7] ترانے وہ گاتے ہیں
بیجو[8] نہ تانسین[9] کو خاطر میں لاتے ہیں

---

[1] ستک اصل میں ستبک ہے۔ سات سُروں کے مجموعہ کا نام ہے جس میں سات سُر چڑھے اور پانچ اترے ہوتے ہیں۔ [2] ارگن باجے کا نام ہے۔ [3] کوکلا سے مراد کوئل ہے۔

[4] ترانہ:- اس گانے میں وہ بول ہوتے ہیں جو حضرت امیر خسرو رح کے ایجاد کئے ہوئے ہیں۔

[5] دھرپت:- وہ گانا جس میں حمد و نعت اور منقبت یا بادشاہوں کی تعریف بیان ہو۔ فنی اعتبار سے اصل راگ کا سادگی کے ساتھ گانا ہے۔ موجد شاہ سدارنگ ہیں۔

[6] خیال:- عاشقانہ مضامین کا گانا جس میں تشبیہات زیادہ ہوتی ہیں۔ اور الاپ کا استعمال ہوتا ہے

[7] ٹپہ:- ٹپے میں فنی اعتبار سے مرکیاں اور پھندے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا موجد شوری پنجابی ہے

[8] بیجو:- بیجو نام۔ باورے لقب۔ قدیم عہد کے گانے کے باکمال تھے۔ درویشوں کی طرح اکثر جنگلوں میں رہتے عموماً کم گاتے۔ لیکن جب جذبات سے مجبور ہو کر گاتے تھے تو مشہور ہے کہ چرند پرند جمع ہو جاتے تھے۔ [9] تانسین اصل نام تنا مکرند پانڈے۔ ریاست ریواں (وسط ہند) کے باشندے تھے۔ والی ریواں اسٹیٹ نے اکبر اعظم کو ایک سفید ہاتھی اور تانسین (باقی صفحہ ۲۰ پر)

سازندے اُن گویوں کے اک ایک بے مثال (۵۶) لکھتی ہوں نام گانے بجانے کا سب کے حال
باقر علی خیال بنے گاتے ہیں جب خیال   زہرہ کو مشتری کو ہے آتا فلک پہ حال

غلمان حوریں خلد میں سر اپنا دھنتی ہیں
اس نور کے گلے کی وہ جب تانیں سنتی ہیں

موسیقی کے یہ عطر ہیں سارے ملازمین (۵۷) لیتے ہیں سننے والے کے ہر طرح دل کو چھین
ہر بین، بین کار بجاتے ہیں ایسی بین   آتے ہرن ہیں سننے علف ترک کرکے چین

اک طرفہ کار ساز کی قدرت کا کھیل ہے
جو جوڑی ہے گویے کی بجو[۱] سمبیل[۲] ہے

سارنگیے وہ دہلی کے حیدر ہے جن کا نام (۵۸) بخشیں رئیس کیوں نہ دوشالے انھیں مدام
سارنگی میں دکھاتے ہیں سو رنگ اپنا کام   تعلیم پائی شاہ سے ہے بے شبہ لاکلام

موہو وہ طبلہ اور پکھاوج[۳] بجاتا ہے
ہاتھوں سے اپنے کام گلے کا دکھاتا ہے

(بقیہ صفحہ ۱۹) جو گانے میں یکتائے روزگار تھے تحفہ پیش کیا تھا جس کی شہنشاہ اکبر نے بڑی قدر کی تھی۔ آخر میں تانسین مشرف باسلام ہو کر حضرت محمد غوث گوالیاری سے بیعت ہو گئے تھے۔ ان کا مزار بھی گوالیار ہی میں اپنے مرشد کے مزار کے متصل واقع ہے۔ تانسین بابا ہری داس سوامی داس کے شاگرد تھے۔

۱؎ اصل: ٹپوں ۲؎ سیدھی تان کو بھی کہتے ہیں۔ لیکن کوئی موزوں معنی معلوم نہ ہو سکے۔ ۳؎ ایک ساز کا نام ہے:-

مالک کی اپنے خیر ہر اک دم منائیے (۵۹) سرکار ذی وقار کے قربان جائیے
کیوں کر دعا نہ نکلے جو احسان اٹھائیے   ہر روز ہم کو جشن ہے یہ لب پہ لائیے
دنیا میں آسرا ہمیں بس اک یہاں کا ہے
سیتا کا قول اور یہی سوکھاں کا ہے

الو جو چوکی کھلنے میں اور نذر آتے ہیں (۶۰) ہر راگنی کی اک نئی گت بجاتے ہیں
گانے سے عشق ہے انہیں ہر وقت گاتے ہیں   خوش ہوتے ہم بھی سنتے ہیں وہ بھی سناتے ہیں
وحدت الاپنا کوئی ترِوٹ[1] ترانہ ہے
اندر[2] کا اب اکھاڑہ اجی چوکی خانہ ہے

موجد ہی اس کا سلامت رہے سدا (۶۱) ایجاد جن کی عقل سے پیارا ہے جوا
ہے ڈھنگ نو سنوار کا سارنگی کی صدا   اور بین کی طرح ہے اچھا بجاتے[4] خوش نوا
معشوق ساز[3] تنہا نرالا بجاتا ہے
ہر صاحبی ہوں سب سے وہ اچھا بجاتا ہے

---

[1] ترِوٹ = وہ گانا جس میں پکھاوج کے بول ہوں۔ [2] اِندر = دیوتاؤں کا راجہ جس سے پانی برسانا بھی متعلق ہے۔ [3] ساز جس میں سُر قائم ہوں اور اترنے چڑھنے نہ ہوں۔
[4] نئے معشوق ساز کے ساتھ چھدا منان البیلی کی بھی تصویر اصل نسخہ میں ہے۔ اس لیے اشعار میں نام نہ آنے کے باوجود ان کا احوال مسدس کی تشبیہوں میں شامل کر لیا گیا ہے۔

گانے بجانے والے ملازم ہیں بے شمار (۶۲) کھڑاگ اتنا کون سنے گا ہے آشکار
ہیں بھاٹ جو بریلی کے مشہور تین چار کرتے چھیاٹر رنڈیوں کی ہیں وہ بار بار
ہم ان کے ادبی مجرے میں حاضر جو ہوتے ہیں
دریا میں شرم کے ہمیں موتی ڈبوتے ہیں

بے مثل ہیں ربابیوں میں آج لاجواب (۶۳) سرکار نے کیا ہے انہیں بہت خوب انتخاب
زیبا ہے ان کے واسطے دوٹلا[1] یکا خطاب سچ جانتے ہیں راگ سُر کا ہی حساب
اے لوگ تنت کاروں[2] کے یہ بادشاہ ہیں
یہ بدر اُن کے بعد جو ہیں تارے ماہ ہیں

استاد پیار خاں کے ہیں فرزند عیاں (۶۴) سو گائنوں سے سن چکے ہیں باجی گیاں
نائک ہیں[3] اپنے فن کے بہادر حسین خاں اللہ رے سرسنگھار[4] بابا ان کا الاماں
ایسے ملازمین نہ کیوں کر ہوں انتخاب
سرکار قدرداں ہیں یہ لوگ لاجواب

---

[1] یہ قدیم زمانے کا لفظ ہے اس کے معنی نہ معلوم ہو سکے

[2] جو سرود، بین، ستار، رباب اور سرسنگھار وغیرہ سازوں کے بجانے میں ماہر ہو۔

[3] نائک گانے اور بجانے دونوں کے کامل ترین استاد کو کہتے ہیں۔

[4] سرسنگھار ساز کا نام ہے۔

معدن گلا ہے سُر کا سریلا ہے خود گلا (۶۵) ہیں اس مصوّری میں تو بہزاد سے سوا
تصویر نقشہ کھینچیں وہ جب اپنے راگ کا — دریا کی طرح گانا گلا ہے بڑھا ہوا

دھرپدیے بین کار[1] ہیں گانے بھی خوب ہیں
گاتے بھی خوب ہیں بجاتے بھی خوب ہیں

قادر سرایان کیوں نہ ہوں ان کے بیان میں (۶۶) نازک خیالیوں کے نہ جو آئے دل میں کیا
ایسی گرہ لگاتے ہیں نازک وہ تان ہیں — مشہور ان کا گانا ہے سارے جہان میں

ایسے گلے ہزاروں میں نایاب ہوتے ہیں
ہر تان کی لڑی میں یہ موتی پروتے ہیں

قوالی گانا گاتے ہیں استاد بے بدل (۶۷) دل کا انہیں کی تان سے کھل جاتا ہے کنول
پتھر کا دل ہو موم وہ لیں تان برمحل — ہو بجلی کو بجلی اس کو پڑے نہ کل

کاظم علی[2] ہے نام میاں بھی خطاب ہے
گانے کا ان کے حسن بہت باصلوب ہے

استادوں میں مراد علی خاں ہیں بے مثال (۶۸) شہرہ تھا ان کے گانے کا گاتے تھے جو خیال
ہر شخص جانتا تھا انہیں صاحب کمال — جو دیکھا لکھنؤ میں بیاں کیا ہے ان کا حال

۱؎ مراد امیر خاں بین کار سے ہے کیونکہ ان اشعار کے تحت میں ان ہی کی تصویر اور نام درج ہے

۲؎ اصل مسدس کے نسخے میں کاظم علی خاں کے ساتھ نثار علی خاں کی بھی تصویر بصراحت نام موجود ہے اس لئے نثار علی خاں کا نام اشعار میں نہ آنے کے باوجود ان کے حالات مسدس کی شخصیتوں کے سلسلے میں لئے گئے

جب فن ہوا جوان تو یہ پیر ہو گئے
خود جا گئے ہیں طالع بیدار ہو گئے

ہے اپنے وقت کا بڑی مصری یہ طائفہ (۶۹) لذت ہے نام کا نہ کیوں کر ہو بامزا
میٹھی زبان لذیذ ہے شیرنی سے سوا   شکر کا گانا کافی ہے مکھن کا ہے گلا
عاشق تنوں میں طائفہ یہ با مذاق ہے
اپنے کمال کسب میں کیا خوب طاق ہے

اپنا جواب رکھتی نہیں آج نورتن (۷۰) گانا گلا سریلا نہایت ہی خوش لحن
رنڈی ہے با تمیز نہیں جھوٹ یہ سخن   جو طائفہ ہے گل ہے تو گویا ان کی ہے چمن
بلبل کا باغ ہوتا ہے دل گل کے سامنے
یہ گل شگفتہ ہوتے ہیں بلبل کے سامنے

ہیں اپنے دونوں کسب میں ستھری نفیس (۷۱) دس حصہ یہ یاد ہیں سب طائفوں سے بیس
شیریں سے بھی زیادہ ہیں سو رنگتی ہیں سلیں   ہر دل عزیز کیوں نہوں کیونکہ ہوں انیس
ہر رنگ میں نایاب ہے اک بے نظیر ہے۔
مداح ممّی جیندو کا اک اسیر ہے

---

۱ اصل نسخے میں تصویر کے اوپر لذت بخش تحریر ہے اور یہی پورا نام ہے۔
۲ عاشق تن: وہ عاشق جو انتہائی پُرجوش عاشق ہیں، اپنے معشوق کے چھلے کو لے کر گرم کرکے اپنے جسم پر بہت سے داغ ڈال لے۔

ستّا ڈیرے دارنیاں ہیں دونوں بیڈیاں (۷۲) تعریف ما جنو کی کیا کیجیے بیاں۔
قابل ہے ہیر بیبوں کی صحبت کے رنڈیاں   جیسی ہے اللہ رکھی زمانے کو ہے عیاں

اپنے مزاج نمبواں امبیلر نہ رکھتی ہیں
اندر کی طرح گھر کو پریخانہ رکھتی ہیں

نبلدت ہنسوڑ کہتا بجا کہ یہ تالی ہے (۷۳) واقف نہیں ہوں گوری ہے یا کہ کالی ہے
شربتی اس کے ناچ سے پریاں کی سالیاں   جادو کی پڑیا تھی یہ کلکتہ والی ہے۔

ہے کھیمٹا[۲] بھی جانتی پر ناچتی نہیں۔
پورب کا کوئی ناچ ادھر ناچتی نہیں۔

کرتے ہیں جو کی خانہ کا جو دل سے بند و بست (۷۴) کیوں نیک نام ہوں نہ حکیم ہند سر پرست
باعث سے ان کی بنا ہے کل جو کی خانہ مست   رتبہ بلند اُن کا رہے ہو کبھی نہ پست

سرکار کا کرم رہے اک آن کے حال پر
نازاں نہ ہو گر کوئی اپنے کمال پر

بلبل ہوئے ہیں جو کلا اپنے گھرانے میں (۷۵) وہ حلق تالو تان سُر ان کے لگانے میں
یکتا یہ کلّہ رہتے ہیں منھ زور گانے میں   مشہور سوز خوانی ہے اکبر زمانے میں

---

[۱] ہیرا اس اوتار کا نام جو علم موسیقی کے موجد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی سالی جو عورت قرار دی گئی ہے وہ کیسی رقاصہ ہو گی۔

[۲] کھیمٹا۔ کولہے مٹکانے کو کہتے ہیں۔

یہ دو گنی ہیں اُن کا ہر اک گن ہے مانا
اچھے ہیں دونوں[1] بھائی زمانہ ہے جانا

پتھر پہ تھا سخت عجب نٹ سوتے کا دل (۷۶) نڑوائی رکھ کے چھاتی پہ جس میں من کی سل
اک نے اٹھایا اونٹ کھڑی تھی جہاں متصل گویا تھا اس کے زور میں چکی کا پل[2] پایا
انعام پایا نٹ وہ ملازم بھی ہو گئے
خوش آیا اک ہنر تو سو عیب ہو گئے

سرکار ہے یہ ہند کے یوسف کی آشنا (۷۷) کیوں کر نہ ہو عزیز عزیزاں کا انتخا
اس کو عطا ہوا ہے زلیخا صفت وقار ہے اس چمن میں مصر کے بازار کی بہار
عباسی اپنا رنگ جداگانہ رکھتی ہے
ہر محفل کو اپنا شیفتہ دیوانہ رکھتی ہے

حاضر جواب رنڈی عجب شوخ و شنگ ہے (۷۸) منگن بھی لکھنؤ کی پری سبز رنگ ہے
جوبن ہے نوجوانی کا دل میں امنگ ہے اڑ بیٹھنے کی رکھتی نرالے ڈھنگ ہے
پیاری جان اس کی بہت باتمیز ہے
خوش مزاج جس کا ہر اک کو عزیز ہے

پیش نظر یہ بنا ہے ہر آن طائفہ (۷۹) مرداسے طائفوں میں علی جان طائفہ

---

[1] مراد حسیم اللہ خاں اور عظیم اللہ خاں سے ہے جن کی تصویر اصل نسخے میں موجود ہے اگرچہ عظیم اللہ خاں کا نام اشعار میں نہیں ہے [2] دیہاتی چکی کے پاٹ کو کہتے ہیں۔ پل کا پل یعنی بھاری بھرکم

اس طائفے پہ اور ہو قربان طائفہ رکھتا زیادہ سب سے ہے یہ شان طائفہ

سرکار کو ہمارے یہی بس ہنساتا ہے

جو نخرے اس کے سنتا ہے خود لوٹ جاتا ہے

ہر روز شادیانہ خوشی کا بجاتے ہیں (۸۰) ہر شب کو نو بجے در دولت پہ آتے ہیں

ہر روز ہیں کے سرخرو سب پر جو چھاتے ہیں ہر روز لال پردے پہ شاہانہ[1] گاتے ہیں

شہنا نواز میر علی جس کا نام ہے

روشن ہے اس کی چوکی یہ یاد تمام ہے

احمد علی سے کم نہیں قاسم علی سے جو (۸۱) اصغر علی حکیم وہ ہیں داستان گو

سید علی بھی فرد ہیں اس فن میں آج تو ہیں لکھنؤ کے چرب زبان وہی کیوں نہ ہو

جھڑتے ہیں پھول منہ سے عجب خوش بیان ہیں

بلبل کی طرح کہتے سدا داستان ہیں

کیا خوب داستان کہی دھوم دھام کی (۸۲) دو داستان گویوں نے یہ بات کی نئی

صحبت یہی چمن میں عجب بے نظیر تھی دو روز میں بھی سننے کو لے بیگماں گئی

حمزہ کی یہ قسم کہی عیاری میر نے

یہ دیکھا بزم لوٹ لی ساری میر نے

---

[1] حضرت امیر خسرو رحمہ کی ایجاد کردہ راگ۔

منشی نے عشق وہ کہا بشاش ہو گئی (۸۳) سن سن کے اس کی گریہ الٰہ باش ہو گئی
جوبن ڈھلا ضعیف میں جوان کی تلاش ہو گئی   لیکن سو جوانوں سے عیاش ہو گئی

یہ پستہ قد ہے قہر کا آفت کا مردوا
یہ داستان گو ہے قیامت کا مردوا

دنیا میں اور ہی نہ بچے نہ ہوں کبھو نہ ہچکو (۸۴) مہاری کا جو غلام رضا کا غلام ہو
استاد خوشنویس ہے اک داستان گو   شاعر ہے بدل کوئی شاعر ہے دیکھ لو

یہ چار دل فن ہیں اسی استاد کے لئے
زیبا یہ فن ہیں ایسے ہی استاد کے لئے

فہرست کاملوں کی یہ اظہار نامہ ہے (۸۵) سرکار جب سنیں گے تو دربار نامہ ہے
بے فکر خانہ کی کہا کار نامہ ہے   سننے میں سہل کہنے میں دشوار نامہ ہے

کر کر کے مختصر سے اسم نویسی سناؤں گی
نواب نامدار سے انعام پاؤں گی

چھوٹے بڑے یہاں جو ہیں سب جانتے ہیں سب (۸۶) دانا و عقل کل کی طرح سے ہیں باادب
سرکار ذوالوقار سے جو ہوں انہیں طلب   زیبا ہے ان کے واسطے یہ حسن کا لقب

اکبر کو یہ بڑے بڑے عاقل[له] کہاں ملے
تھا اس کا نورتن یہ یہ کامل کہاں ملے

له اس بند کے نیچے شیخ وحید الزماں صاحب کی تصویر ہے۔ اس لئے اشعار میں نام نہ آنے کے باوجود مسدس کی شخصیتوں میں ان کے حالات تحریر کئے گئے۔

سرکار کے وکیلوں[1] کے بیٹے تو ہے عیاں (۸۷) ہیں عقل کی زمین فراست کے آسماں
کیا کہا ہوں ان کے وصف فہیم لسانیاں   تحریر میں قلم ہے وہ تقریر میں زباں
لندن تلک سے صاحبوں میں نیک نام ہیں
جو حکم رئیس کا وہ کرنے کام ہیں۔

مشہور شاعروں میں ہیں منشی امیر[2] (۸۸) استاد جن کے منشی مظفر علی اسیر
شاعر جلال اور ذکی دونوں بے نظیر   یہ یاروں آفتاب ہیں چاروں مہ منیر
سرکار اس رباعی کی توقیر کرتے ہیں
قطعے، قصیدے روز یہ تحریر کرتے ہیں

کارند خیر خواہ نہایت نمک حلال (۸۹) دربار میں وزیر علی خاں ہیں بے مثال
یہ عقل کے ہیں پر رسا ذہن ہے کمال   آغاز میں ہی رکھتے ہیں انجام کا خیال
مشہور خانساماں ہیں نوکر قدیم کے
نواب نامدار بہادر کریم کے

---

۱ سرکاری وکیلوں سے مراد مظفر حسین خاں اور احسان حسین خاں دونوں بھائی ہیں جن کی تصویریں اس بند کے نیچے بصراحت نام تحریر ہیں۔ اس لئے اُن کے حالات شخصیتوں کے حالات میں تحریر کئے گئے۔

۲ حضرت امیر مینائی نے اس بند کے شعراء کی تصاویر دیکھ کر حاشیے پر اپنے قلم سے تحریر کیا ہے "سب شبیہیں بالکل غلط ہیں۔ اصل صورت سے ذرا علاقہ نہیں ہے۔" امیر احمد" اس کا عکس شامل کر دیا گیا ہے۔

میری مجال کیا ہے جو کل کی لکھوں ثنا (۹۰) سرکار نے ہے کام بھی ان کو عطا کیا

دہلی کے شاعروں میں ہیں نواب میر   روشن دماغ نور کا گہنا ہے اے بوا

کرتے غزل میں اپنا تخلص وہ داغ ہیں

یہ شاعروں کی بزم میں روشن چراغ ہیں

یہ قدر داں رئیس سلامت رہے مدام (۹۱) درگاہ میں خدا کی یہی ان کا ہے کلام

جن کا کہ شوہر میر مجاور علی ہے نام   مرزائی جامہ خانہ کا نام خدا ہے کام

چھوٹے بڑے خواص حوالے انہیں کے ہیں

کرتے حاشیہ کا کام وہ صد آفریں کے ہیں

آنکھوں سے اپنی دیکھ چکی ہوں میں لاکھ بار (۹۲) میں جھوٹ بولتی نہیں اللہ زینہار

جتنے ہیں ڈیوڑھی دار جہاں تک ہیں چوبدار   سید نذر علی کا ہے ان سب پہ اختیار

اے باجی اماں یہ بھی بڑے نیک نام ہیں

ہیں عرض بیگی مردھے[1] کا کرتے کام ہیں

جلسے کے خانہ کی وہی شب کی انجمن (۹۳) بھولے گا سال بھر نہیں سچ تو ہے یہ سخن

جنت تو بے نظیر ہے اور نہر ہے لبن   کوٹھی کی صاف شان میں ہے عرش کی پھبن

کوثر کا سلسبیل کا جوبن ہے نہر میں

سو بحر خوبیوں کے ہیں اک ایک لہر میں

---

[1] مردھا چوبداران کے سردار کو کہتے ہیں ۔

وہ جلوہ گر تھی روشنی ہر سمت نہر کے (۹۴) موتی کی طرح ہوتے ہیں غش جو کہ دیکھتے
اس باغ میں ہم آئے ہیں ایمن کے دیکھنے — یہ نہر کے کناروں کے ہیں پیڑ بولتے

ہیں نہر بے نظیر ہوں چشمہ حیات کا
باور ہو سوچیا بندوں کو بندی کا بات کا

بولا پٹیلا[۹۵] نہر سے اے نہر سن ذرا (۹۵) رتبہ مجھے قدم سے وہ سرکار کے ملا
کشتی میں نوح کی ہوں سفینہ نجات کا — الیاس خضر کھیویں مجھے تو عجب ہے کیا

مجھ پر حضور کلب علی خاں کا جشن ہے
نواب رام پور سلیماں کا جشن ہے ۔

ہر سال ہوتی سالگرہ ہے حضور کی (۹۶) جلسہ ہے اس کا ہونا یہ صحبت ہے نور کی
خلقت تمام جمع ہے نزدیک دور کی — کچھ لکھنؤ کی بستی ہے کچھ کانپور کی

صدقہ مرے حضور کا اور اُن کی شان کا
سب رامپور دیکھیے لٹا شاہجہان کا

زیبا کلاہ سر پہ سلیمانی تاج ہے (۹۷) جلسا خدا کے فضل سے شاہانہ آج ہے
کہتا ہے عیش کلب علی خاں کا راج ہے — شادی سے جشن لے رہا اپنا خراج ہے

ارباب ہیں نشاط کے انعام لے رہے
نواب نامدار رہیں دے رہے

---

[۹۵] پٹیلا : بجرے کا ہم معنی ہے ۔ ایک قسم کی چپٹی اور سطح کشتی

جن جن کی فرد ہیں ہیں ہوئے اسم انتخاب (۹۸) اور مصاحبوں میں رتبوں میں لاجواب
حاضر حضور کی ہیں حضوری ہیں وہ جناب   صحبت میں تخلیہ کی ہوئے ہیں وہ باریاب
افشاں بڑی رخوں پہ نصیبے چمک گئے
شرلے جن سے تاروں کے دیدے جھپک گئے
ان پر کرم ہو میرے سلیمان کا سدا (۹۹) خالق نے جن کو مرتبہ بلقیس کا دیا
غلمان حور ہیں ناچنے گانے پہ ہیں فدا   داروغہ[1] صاحبہ ہیں وہ ذی رتبہ آپ ہوا
منگلا مکھی[2] ہوں دنیا دعا میرا کام ہے
احباب میں نشاط کی بی جان نام ہے
کہتی ہے طبع طول نہ دے کر تو اختصار (۱۰۰) یارب رہے ہمیشہ یہ سرکار برقرار
ایک اک وحید عصر ہے یکتائے روزگار   اچھا[3] ہے اچھے مرثیہ خوانوں کا افتخار
دونوں ہیں اچھا خوشی غم کے طائفے
بے مثل سوزخوان محرم کے طائفے

---

[1] مراد داروغہ محبوب جان ہیں جن کے حالات پہلے لکھے جا چکے ہیں۔
[2] منگلا مکھی۔ وہ شخص جس کی صورت دیکھنے سے دل کو خوشی اور سکون پیدا ہو۔ منگل کے معنی خوشی کے ہیں
[3] اچھا ۔ سوزخواں کا نام

جب تک ہے جہاں میں کعبہ کی بنا (۱۰۱) جب تک کہ ڈنکا بجتا رہے لوگوں دین کا
یہ میلا جشن کا ہے ہر سال یا خدا   نواب نامدار کو راحت ہو دائما

جو کچھ لکھا ہے میں نے ریاضت قبول ہو
حق ہو ادا نمک کا سعادت حصول ہو

اچھا برا اگلا سٹرا جو کچھ تھا جتنا مال (۱۰۲) میلے کا سب بدلیا سب ہوئے نہال
ہر اک کمال والے کا پوچھا گیا کمال   تھا جشن اگلے سال سے بھی بڑھ کے اب کے سال

شہروں میں رامپور کی اب دھوم ہو گئی
شادی ہزاروں کوسوں یہ معلوم ہو گئی

سرکار ذی وقار کے اقبال کو سدا (۱۰۳) اللہ دے ترقی یہی اپنی ہے دعا
واللہ میلا جشن کا کیا خوب ہے ہوا   اے جان کیا مجال مری جو کروں ثنا

لاکھوں ہی جلسے ہو گئے موزوں نہ ہو سکے
موزوں کسی طرح سے وہ مضموں نہ ہو سکے

تمام شد

صحت نامہ

مجھے دلی افسوس ہے کہ میں اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کاتب اور مصحح صاحبان سے حسب منشا کام لینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے بوجہ مجبوری مختصر سا صحت نامہ شامل کرنا پڑا۔

اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ جان صاحب کا جو عکس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اس کی شبیہ مسدس کے اصل نسخہ کے صفحہ ۹۵ پر ہے اور مسدس کی دو شخصیتوں مظفر حسین خاں اور احسان حسین خاں کے قدرے مفصل حالات مکاتیب غالب کے صفحہ ۱۰۷ طبع سوم میں ملاحظہ ہوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱	۱	تحتیہ	تحتیر	۴۷	۱۰	دامنے	دُھنے
۲۴	۱۴	قدرے کے	قبیلے کے	״	״	عن	متن
۲۷	۳	نکھرنے	نکھرتے	۴۹	۱۱	انام	امام
۳۷	۵	۱۲۵۰	۱۲۹۰	۵۰	۸	مستجمع	مستنبط
۴۱	۷	نبھایا	نباہا	۶۱	۷	مارتا ہے	مارتا
۴۶	۱۴	خود	خُرد	۶۳	۳	لوٹیاں	لولیاں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٦٣	١٣	نعّت	نعت	٩٦	١٦	اعلیٰ	اسی
٦٤	١١	سرُوپ	بشن سرُوپ	٩٧	١٦	جانے کا جانے کا	جانے کا
٦٥	٨	باہم	باہم	١٠٦	١٢	دی جاہ	ذی جاہ
٧١	١٥	چمکیں	چپلیں	١١٥	٤	لازم	ملازم
٨٠	٥	تانسین	تانسین	١١٨	١	١٨٩	١٨٩٦
٨٥	١٥	کیبو	کیبنو	١١٨	٩	مسہور	مشہور
٨٦	٣	کرنا	کرنا	١١٩	٣	منی	ننی
٩٣	٤	مراریں	مزاریں	١٢٨	٨	میاں نظیر	میاں اسیر
٩٦	١٠	نہیں لیلے	نہیں لیلے				

مسدس

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١٠	١٥	بستہ اور توڑا	بستہ اور	٢٥	١	سیاہ ڈبیے دار	سیاہ ڈبیے والے
٣٢	٥	مرثیہ	مرثیہ				

تالیفات و تصنیفات

محمد علی خاں اثر رامپوری

۱- ذخیرہ معلومات | فارسی زبان کی معلومات عامہ کا نایاب رسالہ جو
پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر باب اپنے مختلف موضوع کے لحاظ سے کتب کثیرہ کا
خلاصہ ہے۔ امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ کے لئے بے حد مفید ہے

مطبوعہ قیمت ایک روپیہ (عہ)

۲- انشائے جدید | ایرانی طرز مراسلت پر بہترین کتاب جس کو ملک کے
مشاہیر نے ہندوستان میں پہلی کوشش سے تعبیر کیا ہے اور پہلے مسلم یونیورسٹی کے
ایف۔ اے کے نصاب میں داخل بھی رہ چکی ہے۔ اور یوپی اور حیدرآباد ذخیرہ میں
انعام اور کتب خانوں کے لئے منظور ہو چکی ہے۔ مطبوعہ قیمت (عہ)

۳- ارمغان پارس | فارسی کے جدید و قدیم لغات کا مختصر رسالہ جو فارسی کے
طلبہ کو اردو سے فارسی میں ترجمہ کے لئے بے حد مفید و معین ہے مطبوعہ قیمت (۸)

۴- مسدس بے نظیر جان صاحب بخشی گو | مطبوعہ قیمت (۴ر)

۵- لالہ زار | غزلوں کا انتخاب | زیر طباعت

۶- شمع یثرب | نعتیہ کلام | زیر طباعت

ملنے کا پتہ:- خسرو باغ روڈ۔ رامپور۔ یو۔پی۔ بھارت